سہ ماہی

تحقیقات شرعیہ لکھنؤ

مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کا ترجمان

سہ ماہی تحقیقات شرعیہ لکھنؤ

شمارہ:۱ ❁ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۲۴ء

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر
عتیق احمد بستوی

نائب مدیر
منور سلطان ندوی

مجلس مشاورت

❁ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ❁ ڈاکٹر علی احمد ندوی ❁ مولانا عبید اللہ اسعدی
❁ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی ❁ مولانا ڈاکٹر فہیم اختر ندوی ❁ مفتی راشد حسین ندوی
❁ مفتی محمد ظفر عالم ندوی

مجلس ادارت

❁ مفتی مسعود حسن حسنی ندوی ❁ مولانا رحمت اللہ ندوی
❁ مولانا ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی ❁ مولانا ڈاکٹر محمد علی ندوی

مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ، یوپی، پن کوڈ:226007
E-shariahacademynadwa@gmail.com
www.mtsnadwa.org

فہرست مضامین

	اداریہ	مدیر	۳
قرآنیات			
	تفسیر ابن جریر طبری: ایک جامع تعارف	مولانا فیصل احمد ندوی	۸
مقاصد شریعت			
	اجتہاد وتقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۱۵
	شریعت کے مقاصد اور مصالح	مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۲۱
	معاصر اجتہاد: عمل، تقاضے اور مشکلات	مولانا ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی	۳۰
ادب اختلاف			
	فقہاء کے اختلاف میں علم حدیث کے اثرات	مولانا عتیق احمد بستوی	۳۸
فقہی تحقیقات			
	وقف کی شرعی حیثیت اور اس کا استبدال	مولانا محمد ظفر عالم ندوی	۵۸
	فسخ نکاح کے چند اسباب اور کچھ جدید شکلیں	مولانا رحمت اللہ ندوی	۶۸
سیرت			
	عہد نبوی میں ابلاغ کے ذرائع	مولانا منور سلطان ندوی	۷۷
تعارف وتبصرہ			
	مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ: ایک معروضی مطالعہ	مولانا ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۹۲
سرگرمیاں			
	مجلس تحقیقات شرعیہ کی علمی خدمات	محمد مرغوب الرحمن ندوی	۹۹
	مجلس تحقیقات شرعیہ کی موجودہ سرگرمیاں	عباد الحق آسامی ندوی	۱۰۹

اداریہ

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی خاتم الأنبیاء والمرسلین، محمد بن عبد اللہ الأمین، وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین، أما بعد!

علم وتحقیق، تصنیف وتالیف ابتدا ہی سے ندوۃ العلماء کے خمیر میں شامل رہا، اس کے بانیان حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا نواب حبیب الرحمن شیروانیؒ، حضرت مولانا عبدالحی حسنیؒ، حضرت مولانا عبدالحق حقانیؒ وغیرہ اپنے عہد کے بلند پایہ اہل تحقیق اور اصحاب فکر، ربانی علماء تھے، جنہوں نے ہمیشہ قرطاس وقلم سے اپنا مضبوط رشتہ رکھا، اور علم وتحقیق کی دنیا میں گراں قدر تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں، جن سے انشاء اللہ ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا اور ان کی تصنیفات اور رسائل امت مسلمہ کی رہبری کرتی رہیں گے۔

آخری صدیوں میں (انیسویں، بیسویں صدی) علم اور دین کی خدمات کا ایک نیا اور مفید طریقہ یہ سامنے آیا کہ علمی، تحقیقی، اصلاحی اور دعوتی موضوعات پر رسائل وجرائد اور میگزین شائع کیے جائیں، جن کے اشاعت کی ایک متعین مدت ہو مثلاً ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی وغیرہ، یہ رسائل اور میگزین مختلف مقاصد کے لیے شائع کئے جاتے ہیں، کچھ رسائل وجرائد علمی وتحقیقی ہوتے ہیں، کچھ دعوتی واصلاحی، بعض تاریخی وادبی بھی ہوتے ہیں، تحریک ندوۃ العلماء جو ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت خدمات انجام دینا چاہتی تھی، وہ اس اہم میدان کو کیسے نظر انداز کرسکتی تھی، چنانچہ ندوۃ العلماء کے بانیان نے ''الندوہ'' کے نام سے ایک ماہانامہ جاری کیا، جس کی ادارت علامہ شبلی نعمانی اور مولانا نواب حبیب الرحمن شروانی فرما رہے تھے، بہت جلد اس ماہ نامہ رسالہ نے غیر منقسم ہندوستان میں شہرت حاصل کرلی، اور برصغیر کے علماء ومشائخ اور اہل دانش کا طبقہ اس کے تازہ شمارے کے انتظار میں رہا کرتا تھا، ''الندوہ'' اسلامی علوم وفنون کا بہترین میگزین تھا، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت وتاریخ اور کلامی مباحث پر اس میں معیاری مضامین شائع ہوتے تھے، علامہ شبلی اور نواب حبیب الرحمن شروانی کے معیار تحقیق اور خصوصی توجہات نے ماہنامہ کو بلندی کی چوٹی تک پہنچایا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ علامہ شبلی کے مایہ ناز شاگردوں نے الندوہ ہی میں تصنیف وتحقیق کی تربیت پائی، اور ان کے نام علمی دنیا میں معروف ہوئے، تقریبا سات سال (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۲ء) تک یہ ماہنامہ بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا، اور برصغیر کے علمی دنیا میں اس نے اپنا مقام بنالیا، اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ ماہ نامہ ''الندوہ'' ندوۃ العلماء لکھنو ماہ نامہ ''معارف'' دارالمصنفین اعظم گڑھ کا پیش رو تھا، علامہ شبلی نعمانی کے جانشین اور ان کے عظیم شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی

نے اپنے رفقاء کار کے ساتھ الندوہ کے بند ہونے سے پیدا ہونے والے خلا کو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے ذریعے سے پر کرنے کی کوشش کی، جس کا آغاز ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا رشتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے برابر استوار رہا، وہ پونہ کالج سے ملازمت ترک کر کے اپنے استاذ گرامی علامہ شبلی نعمانی کی طلب پر دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے تھے، واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء نے اپنے استاذ گرامی کے تیار کردہ خاکہ میں رنگ بھرا، اور علامہ شبلی نے جس دارالمصنفین کا خواب دیکھا تھا اسے شرمندہ تعبیر کیا، علامہ سید سلیمان ندوی اپنے استاذ کے وفادار اور لائق ترین شاگرد تھے، ان کے مزاج میں اعتدال اور ٹھہراؤ تھا، اس لیے علامہ شبلی کے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علیحدگی اور یکسوئی کے باوجود سید صاحب کا اپنے مادر علمی سے رابطہ برابر استوار رہا، اور علامہ شبلی نعمانی کے علاوہ جن دوسرے اساتذہ سے انہوں نے اکتساب علم کیا تھا ان کے بھی وہ ہمیشہ شکر گزار اور قدردان رہے، ندوۃ العلماء کے اراکین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے انہیں ہمیشہ عزت و احترام کا مقام دیا، اور رفتہ رفتہ وہ سید الطائفہ بن گئے، طویل مدت تک معتمد تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی اور تربیتی نظام کی رہنمائی فرماتے رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں کبھی دوئی کا احساس نہیں پیدا ہوا، بلکہ دونوں ادارے ایک ہی چشمہ فیض کی شاخیں محسوس ہوتے تھے، دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ندوۃ العلماء کا تصنیفی و تحقیقی بازو سمجھا جاتا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد شاہ معین الدین ندوی دارالمصنفین کے سربراہ مقرر ہوئے، اور دارالمصنفین کے رفقاء عام طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فضلا ہوا کرتے تھے، شاہ معین الدین ندوی کی وفات کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین کے سربراہ ہوئے، ان کے دور میں بھی یہی صورتحال برقرار رہی۔

ماہنامہ الندوہ کی اشاعت بند ہونے کے بعد ندوۃ العلماء سے اردو زبان میں پھر کوئی خالص علمی اور تحقیقی مجلہ جاری نہیں ہوا، ہاں ۱۹۶۳ء میں پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' جاری ہوا، جو الحمدللہ اس وقت سے برابر شائع ہو رہا ہے، اور اس کی اچھی اشاعت ہے، لیکن تعمیر حیات پر دعوتی، اصلاحی اور فکری رنگ غالب ہے، تعمیر حیات کی اپنی جگہ بڑی افادیت ہے لیکن اس سے وہ خلا پر نہیں ہوا جو الندوہ کے بند ہونے سے ہوا تھا۔

عربی صحافت کے میدان میں ندوۃ العلماء سے ۱۹۳۲ء میں مجلہ ''الضیاء'' کی اشاعت شروع ہوئی، ''الضیاء'' نے عرب ممالک میں بھی اچھا مقام پیدا کر لیا، اس میں بہت فکر انگیز اور دعوتی مضامین شائع ہوتے تھے، لیکن الضیاء مختلف اسباب کی بناء پر ۱۹۳۵ء میں بند ہو گیا، اور ۱۹۵۵ء میں ''البعث الاسلامی'' ندوۃ العلماء کے افق پر طلوع ہوا، الحمدللہ اس وقت سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے فکر و پیغام کو اور ان کی دعوت کو بلاد عربیہ تک پہنچانے میں البعث الاسلامی کا خاص حصہ رہا ہے، حضرت مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن الاعظمی دامت برکاتہم کی محنتوں اور جگر سوزیوں کی وجہ سے البعث الاسلامی نے اپنا معیار و اعتبار قائم کیا، اور حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن الاعظمی صاحب اپنے امراض و اعذار کے باوجود اپنے معاونین کی مدد سے آج بھی البعث الاسلامی کی روشنی اور تابانی باقی رکھے ہوئے ہیں، پندرہ روزہ عربی جریدہ "الرائد" بھی ندوۃ العلماء لکھنو کے ذمہ داروں اور بزرگوں کا ایک مفید قدم ہے، جس نے ہندوستان کی عربی صحافت میں نئے نقوش چھوڑے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی اور سرپرستی میں حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے الرائد کو اپنے خون جگر سے سینچا، اور اسے نوجوانوں کی فکری اور ادبی تربیت کا بہترین پلیٹ فارم بنا دیا۔

عربی صحافت کے میدان میں ندوۃ العلماء اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی یہ قابل رشک حصولیابیاں اپنی جگہ پر، لیکن الندوہ کے بند ہونے سے علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو خلا پیدا ہوا اس کی تلافی نہیں ہو سکی۔

۱۹۶۳ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس دور کے ممتاز ترین علماء اور فقہاء کے ساتھ دور حاضر کے نئے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل تلاش کرنے کے لیے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنو کی بنیاد رکھی، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اس کے صدر منتخب ہوئے، اور مجلس کے پہلے ناظم مشہور صاحب تصانیف عالم حضرت مولانا تقی امینی رحمۃ اللہ علیہ بنائے گئے، جو فقہی موضوعات پر برابر لکھتے تھے، اور ان کی بعض تصنیفات بھی شائع ہو چکی تھیں، ان کے دور نظامت میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی ایک ہی نشست ہو سکی، جس میں مجلس کے اغراض و مقاصد طے کیے گئے، اس کی خاکہ سازی ہوئی، اور مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے منہج پر تبادلۂ خیالات ہوئے، لیکن جلد ہی وہ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی دعوت پر علی گڑھ منتقل ہو گئے، ان کے جانے کے بعد ۱۹۶۴ء میں صدر مجلس نے اہم ارکان سے مشورہ کر کے حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ کو مجلس کا ناظم نامزد فرمایا، ان کے دور نظامت میں مجلس خاصی فعال رہی، اس کے کئی اجلاس منعقد ہوئے، اور انشورنس اور رویت ہلال وغیرہ اہم موضوعات پر مجلس نے فیصلے کیے، لیکن ۱۹۷۰ء میں ان کے پاکستان منتقل ہو جانے کی وجہ سے یہ عہدہ پھر خالی ہو گیا، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اس کام کی اہمیت کے پیش نظر مجلس تحقیقات شرعیہ کے لیے بڑے فکر مند تھے، اور انہوں نے ۱۹۷۱ء میں حضرت مولانا برہان الدین سنبھلیؒ کو مجلس کا ناظم مقرر فرمایا، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی نے مجلس کو متحرک کرنے کی کوشش کی، اور پوری تیاری کے ساتھ سرکاری سودی قرضوں کے موضوع پر مجلس کی میٹنگ بلائی، جس میں چوٹی کے ممتاز علماء اور فقہاء شامل ہوئے، لیکن موضوع پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا، اور اسے آئندہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا، اس کے بعد خدا جانے کے کیا اسباب ہوئے کہ مجلس تحقیقات شرعیہ قائم تو رہی اور حضرت مولانا برہان الدین صاحب اس کے تحت علمی اور فقہی موضوعات پر آنے والے سوالات کے جوابات تحریر فرماتے رہے، بعض رسائل اور کتابیں بھی شائع کیں، لیکن نئے فقہی مسائل پر اجتماعی غور و خوض کا کام (جو مجلس تحقیقات شرعیہ کا بنیادی کام تھا) موقوف رہا، دسمبر ۱۹۹۹ء میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے

وفات کا سانحہ پیش آیا، اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری سونپی گئی، اس کے بعد بھی مجلس تحقیقات شرعیہ کی وہی صورتحال رہی جو پہلے تھی۔

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی کی وفات ۲۰۲۰ء میں ہوئی، وفات سے چند سال پہلے سے وہ معذور ہو چکے تھے، فالج سے کافی متاثر تھے، حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ناظم ندوۃ العلماء تھے، ان کے ذہن پر اس فکر کا غلبہ ہوا کہ مجلس تحقیقات شرعیہ کا احیائے نو کیا جائے، اور اس کے تحت خاص طور سے نئے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل اجتماعی غور و خوض کے ذریعے انجام دیا جائے جو اس مجلس کا بنیادی مقصد تھا، انہوں نے ۳ صفر ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو دفتر نظامت سے حکم نامہ جاری فرمایا اور احقر کو ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے پر مامور فرمایا، حضرت مولانا رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کے مطابق مولانا سید حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے تبادلہ خیال کر کے مجلس کا نیا نظام بنایا گیا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید محمد حمزہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے مجلس تحقیقات شرعیہ کے مقاصد میں توسیع کی گئی اور درج ذیل ۱۰ مقاصد طے کیے گئے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ دور حاضر کے پیدا کردہ نئے مسائل نیز وہ قدیم احکام ومسائل جو بدلے ہوئے عالمی یا ملکی حالات میں از سر نو غور وخوض کے محتاج ہیں، ان پر اجتماعی غور وخوض اور شرعی فیصلہ کی کوشش کرنا اور امت مسلمہ کو ان فیصلوں سے واقف کرانا۔

۲۔ دور حاضر میں جن مسائل اور سوالات پر سنجیدہ بحث وتحقیق کی ضرورت ہے، ان کی فہرست سازی کرنا اور ان مسائل وسوالات پر محقق علماء وفقہاء اور باصلاحیت وحوصلہ مند فضلائے مدارس وجامعات سے کتابیں اور مضامین لکھوانا اور انہیں مختلف زبانوں میں شائع کرانے کی کوشش کرنا۔

۳۔ اسلام کی جن تعلیمات کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں یا اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان موضوعات پر اطمینان بخش لٹریچر تیار کرنا اور پرنٹ والیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اسے پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ پوری دنیا اور خصوصا عالم عربی اور عالم اسلامی میں فقہ اور شریعت کے بارے میں جو تحقیقی ادارے یا فقہ اکیڈمیاں ہیں، ان کے سیمیناروں، کانفرنسوں اور تحقیقی کاموں سے واقف رہنے اور ان سے علمی رابطہ رکھنے کی کوشش کرنا اور ہندوستان کے ممتاز فقہاء وعلماء کو ان سے واقف کرانے کی کوشش کرنا۔

۵۔ اسلام کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے بارے میں ایسی کتابیں اور مضامین تیار کرانا جن میں ان قوانین کی بھرپور وضاحت ہو، ان پر کئے جانے والے اعتراضات وشبہات کے اطمینان بخش جوابات ہوں، اور دوسرے عائلی قوانین سے ان کا موازنہ بھی کیا گیا ہو۔

۶۔ ہندوستان کی اعلی عدالتوں (سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ) کے مسلم پرسنل لا کے بارے میں دئے گئے مخالف شریعت فیصلوں کا قانونی اور شرعی جائزہ تیار کرانا اور اسے شائع کرانے کی کوشش کرنا۔

۷۔ دارالافتاء ندوۃ العلماء میں آنے والے اہم اور تحقیق طلب سوالات ومسائل کا تحقیقی جواب تیار کرنا۔

۸۔ دارالعلوم ندوۃ کے طلبہ میں فقہی ذوق ومزاج کو پروان چڑھانے کے لئے اہم فقہی موضوعات پر محاضرات، مقابلے، مذاکرے منعقد کرانا۔

۹۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کم از کم دو ہونہار فضلاء جن کی فقہ وافتاء میں اچھی صلاحیت ہو، انہیں معقول اسکالرشپ کے ساتھ تصنیفی تربیت کے لئے منتخب کرنا، اوران سے فقہی موضوعات پر علمی وتحقیقی کام لینا تاکہ مستقبل میں وہ فقہی وشرعی موضوعات پر بہتر سے بہتر کام کرسکیں۔

۱۰۔ مذکورہ بالا مقاصد کو بروکار لانے کے لئے مختلف اقدامات کرنا، پروگرام بنانا، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کرانا، اسٹڈی گروپ تشکیل دینا، ورکشاپ منعقد کرنا، وغیرہ۔

الحمدللہ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء احیاء نو کے بعد اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے، دو فقہی سیمینار ہو چکے ہیں، انشاء اللہ تیسرا ابھی ہونے والا ہے، مسلم فیملی لا کے موضوعات پر وکلا اور علماء کا ماہانہ پروگرام جاری ہے، آخری جماعتوں کے طلباء کے لیے لیگل لٹریسی پروگرام ہر ہفتہ پابندی کے ساتھ ہو رہا ہے، اس مختصر مدت میں مجلس اپنی خاصی کتابیں شائع کرچکی ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کے مقاصد میں مجلس کے سرپرستان اور ارکان مشاورت کے مشورے سے جو توسیع کی گئی ہے اس کا ایک اہم تقاضہ یہ بھی ہے کہ کم از کم ایک سہ ماہی علمی وتحقیقی مجلہ مجلس سے شائع ہوا کرے، اس مجلہ کا دائرہ وہی ہوگا جو مجلس کے لئے طے کردہ دس مقاصد کے ذیل میں آتا ہو، اس کا غالب رنگ تو شرعی وفقہی تحقیقات کا ہوگا، لیکن دوسرے علوم اسلامیہ (تفسیر، حدیث، کلام وغیرہ) پر بھی اچھے معیاری مضامین وقتاً فوقتاً شائع کئے جائیں گے، اور کوشش کی جائے گی کہ چند صفحات ملک وبیرون ملک کی علمی خبروں، پروگراموں اور علوم اسلامیہ پر ہونے والے تحقیقی اور تصنیفی کاموں کے بارے میں بھی ہوں، اگر اس مجلہ کو ملک و بیرون ملک کے اصحاب علم وتحقیق علماء اور متخصصین کا سرگرم تعاون رہا تو انشاء اللہ تعالی تین مہینے پر پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا، فی الحال تو ذمہ داروں کا یہی فیصلہ ہے کہ اسے ای۔مجلہ کی شکل میں جاری کیا جائے، لیکن تحقیقات شرعیہ کا یہ پہلا شمارہ جو مجلس تحقیقات شرعیہ کے چھٹے فقہی سیمینار ۳۰/ نومبر و یکم دسمبر ۲۰۲۴ کے موقع پر شائع ہونے جارہا ہے اس کی کچھ محدود کاپیاں شرکائے سیمینار کو مطبوعہ شکل میں پیش جائیں گی، اگر آئندہ اہل علم کا تقاضا ہوا اور وسائل میں گنجائش ہوئی تو انشاء اللہ مجلہ تحقیقات شرعیہ ای۔مجلہ ہونے کے ساتھ کتابی مجلہ بھی ہوجائے گا، اللہ تعالی اسے قبولیت سے نوازے، قبول فرمائے اور امت مسلمہ کے لیے نافع بنائے۔

عتیق احمد بستوی

سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء

تفسیر ابن جریر طبری

ایک جامع تعارف

مولانا فیصل احمد ندوی
(استاد تفسیر وحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

قرآن کریم کا سب سے پہلا، ضروری اور حقیقی تعارف یہی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ملا ہوا سب سے آخری ہدایت نامہ ہے، جو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ چوں کہ وہ آخری الٰہی دستور ہے، اس لیے ہر مسئلے کا حل اس میں بتایا گیا، اور ہر چیز کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴿النحل: ۸۹﴾ اور کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ﴿الأنعام: ۳۸﴾

رہتی دنیا تک جو ضرورت انسان کو پیش آسکتی ہے، اور جو سماجی یا سیاسی مشکل اس کو در پیش ہو سکتی ہے، ان سب کا حل اس میں چوں کہ پیش کیا گیا ہے، اس لیے اس کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ اس میں اجمالی انداز اختیار کیا جاتا۔ زمانۂ نبوت سے دوری کے ساتھ اس اجمال کی تفصیل کی ضرورت بڑھتی گئی، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے مساجد میں دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور روایاتِ حدیث کو جمع کرنے کے ساتھ جب تصنیف کا آغاز ہوا تو تفسیر کے موضوعات میں بھی کتابیں لکھی جانے لگیں، چناں چہ مشہور تابعی حضرت عطاء ابن ابی رباح (متوفی ۱۱۴ھ) کی کتاب غریب القرآن کا ذکر ملتا ہے، جس کو تفسیر کے کسی موضوع پر لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔ یہ دراصل حضرت ابن عباس کی مرویات ہیں، جن کو عطاء نے مرتب کیا ہے۔ (اس کا مخطوطہ ترکی کے مکتبہ عاطف آفندی میں موجود ہے) اور اگر تاریخِ وفات کے لحاظ سے دیکھیں تو سب سے پہلے مستقلاً تفسیر پر کتاب لکھنے والے مشہور محدث وفقیہ ابن جریج (عبد الملك بن عبد العزيز بن جريج المكي المتوفى ۱۵۰ھ) معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تفسیر بتحقیق دکتور عبد الرحمن بن حسن فائد دار الکمال المتحدہ دمشق سے اور علی حسن عبد الغنی کی تحقیق کے ساتھ مکتبۃ التراث الاسلامی بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔

عہدِ روایت یعنی ابتدائی چار صدیوں بلکہ پانچویں صدی کے اوائل تک جو کتابیں تفسیر میں لکھی گئیں، وہ سب روایات پر مبنی تھیں، یعنی آیات کے تحت احادیث مرفوعہ اور صحابہ وتابعین کے آثار اپنی اسانید سے انھوں نے ذکر

کیے ہیں۔ان کے علاوہ ان تفاسیر میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ابن جریج (وفات:۱۵۰ھ) سے لے کر ابن مردویہ (وفات: ۴۱۰) تک پچاس سے زائد اس قسم کی تفاسیر کا ذکر ملتا ہے۔ان تفاسیر میں اختلافِ اسانید کے ساتھ روایات کا تکرار بکثرت ہے۔اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے ان کے اجمالی تذکرے کے بعد لکھا ہے کہ ان میں چار تفسیریں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں: تفسیر عبد ابن حمید (وفات: ۲۴۹) تفسیر ابن جریر (وفات: ۳۱۰ھ) تفسیر ابن المنذر (وفات:۳۱۸ھ یا ۳۱۹ھ) اور تفسیر ابن ابی حاتم (وفات:۳۲۷)۔تفسیر سے متعلق احادیث و آثار میں سے شاید ہی کچھ ان میں درج ہونے سے رہ گئے ہوں (۱)۔

لیکن ان میں صرف تفسیر ابن جریر واحد تفسیر ہے، جس میں اس کے مصنف نے سب سے ہٹ کر اجتہاد سے کام لیا ہے، اور احادیث و آثار کے علاوہ بہت سی باتیں پہلی دفعہ ذکر کی ہیں، جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔خدا کی شان کہ ان میں سے صرف ابن جریر کی تفسیر ہی پوری محفوظ ہے۔بقیہ تینوں تفسیروں کے اکثر حصے مفقود ہیں (۲)۔

امام ابن جریر طبری اور ان کی تفسیر

امام ابن جریر کے مفصل تعارف کا یہ محل نہیں، نہ اس کی یہاں ضرورت ہے۔مختصر یہ کہ پورا نام ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہے۔طبرستان کی طرف ان کی نسبت ہے، جو اس وقت شمالی ایران میں ہے۔ ۲۲۴ھ میں پیدائش ہوئی۔ اور ۳۱۰ھ میں وفات ہوئی۔تمام علوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔علمائے امت کے حالات کا اگر جائزہ لیں، تو ایسے علماء بہت کم ملتے ہیں، جن کو متعدد علوم میں بیک وقت امامت کا درجہ حاصل ہو۔امام ابن جریر طبری انھی چند علماء میں سے ہیں، جن کی حدیث، تفسیر، فقہ، لغت، قرات اور تاریخ میں امامت تسلیم کی گئی۔

ایک طرف ان کو شیخ المفسرین اور عمدۃ المفسرین کہا گیا ہے۔تو دوسری طرف حافظِ حدیث بھی قرار دیا گیا ہے۔ تیسری طرف ان کو فقیہ مجتہد تسلیم کیا گیا ہے، یہاں تک کہ عرصے تک مذہبِ حنبلی کی طرح مذہبِ جریری رائج تھا۔ چوتھی طرف وہ امام المؤرخین بھی تھے۔پانچویں طرف وہ فنِ قرأت کے بھی امام تھے۔چھٹی طرف لغت میں بھی ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ساتویں طرف فنِ نحو میں بھی وہ چوٹی پر تھے۔

ہم یہاں چند کبار علماء و مؤرخین کی عبارتیں نقل کرتے ہیں، جن سے مختلف علوم میں امام طبری کی امامت اور منتہائے کمال کا اندازہ ہوتا ہے:

امام ابن جریر کے شاگرد اور تذکرہ نگار شیخ عبدالعزیز بن محمد طبری لکھتے ہیں:

وكان ظَلِفاً (وفي نسخة:عازفاً) عن الدنيا تاركا لها ولأهلها يرفع نفسه عن التماسها، وكان كالقارىء الذي لا يعرف إلا القرآن، وكالمحدّث الذي لا يعرف إلا الحديث، وكالفقيه الذي لا يعرف إلا الفقه، وكالنحويّ الذي لا يعرف إلا النحو، وكالحاسب الذي لا يعرف إلا الحساب، وكان عاملا

للعبادات جامعا للعلوم، وإذا جمعت بين كتبه وكتب غيره وجدت لكتبه فضلا على غيرها (۳).

وہ بڑے زاہد اور دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش تھے، طلب دنیا سے اپنے کو انھوں نے بہت بلند کر رکھا تھا۔ وہ ایسے قاری تھے کہ قرآن کے علاوہ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں، اور ایسے محدث تھے لگتا تھا کہ صرف حدیث ہی وہ جانتے ہیں، اور ایسے فقیہ تھے معلوم ہوتا تھا کہ فقہ ہی ان کا موضوع ہے، اور ایسے نحوی تھے ظاہر ہوتا تھا کہ نحو ہی سے ان کا اشتغال ہے، اور ایسے ریاضی دان تھے لگتا تھا کہ حساب کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ عبادتوں میں مشغول رہتے تھے اور متعدد علوم کے جامع تھے۔ ان کی کتابوں اور دوسروں کی کتابوں کو اگر آپ جمع کریں تو ان کی کتابوں کی دوسری کتابوں پر برتری آپ کو صاف نظر آئے گی۔

حافظ خطیب بغدادی (ت: ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

وكان أحد أئمة العلماء، يحكم بقوله، ويرجع إلى رأيه لمعرفته وفضله. وكان قد جمع من العلوم ما لم يشاركه فيه أحد من أهل عصره، وكان حافظا لكتاب الله، عارفا بالقراءات، بصيرا بالمعاني، فقيها في أحكام القرآن، عالما بالسنن وطرقها، وصحيحها وسقيمها، وناسخها ومنسوخها، عارفا بأقوال الصحابة والتابعين، ومن بعدهم من الخالفين في الأحكام، ومسائل الحلال والحرام، عارفا بأيام الناس وأخبارهم، وله الكتاب المشهور في »تاريخ الأمم والملوك«، وكتاب في التفسير لم يصنّف أحد مثله، وكتاب سماه »تهذيب الآثار« لم أر سواه في معناه إلا أنه لم يتمه، وله في أصول الفقه وفروعه كتب كثيرة، واختيار من أقاويل الفقهاء، وتفرّد. بمسائل حفظت عنه (۴).

وہ ایک بڑے عالم بلکہ امام العلماء تھے، ان کے علم وفضل کی وجہ سے ان کی بات کے مطابق فیصلہ کیا جاتا اور ان کی رائے کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ وہ اتنے علوم کے جامع تھے کہ ان کے معاصرین میں کوئی ان کا اس میں شریک وسہیم نہیں تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے، مختلف قراتوں کے ماہر تھے، معانی قرآن پر ان کی گہری نظر تھی، فقیہ تھے، احکام قرآن میں دستگاہ حاصل تھی، أحادیث وسنن اور ان کے طرق واسانید سے پورے واقف تھے، صحیح وضعیف اور ناسخ ومنسوخ کا انھیں پورا علم تھا، احکام کے سلسلے میں صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار اور بعد کے علماء کے مختلف آراء واقوال سب ان کے علم میں تھے، وہ دنیا کی تاریخ اور لوگوں کے احوال وواقعات کے بڑے عالم تھے، تاریخ الامم والملوک میں ان کی کتاب بہت مشہور ہے، تفسیر میں ان کی جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی، "تہذیب الآثار" کے نام سے ان کی ایک کتاب ہے اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب ہمارے علم میں نہیں ہے، اگرچہ اس کو مکمل نہیں کر سکے، اصول فقہ اور فقہی احکام میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں، فقہ ان کے ترجیحی اقوال بھی ہیں اور کچھ مسائل میں ان کا تفرد بھی ہے۔

امام ذہبی (ت: ۷۴۸ھ) کی عبارت ملاحظہ ہو:

كان ثقة، صادقا، حافظا، رأسا في التفسير، إماما في الفقه، والإجماع والاختلاف، علامة في

التاريخ وأيام الناس، عارفا بالقراءات وباللغة، وغير ذلك (۵).

وہ بڑے ثقہ محدث اور حافظ حدیث تھے، تفسیر میں صدر نشین اور فقہ میں امام وقت تھے، اسی طرح اجماع اور اختلافی مسائل میں بھی امامت کے درجے پر فائز تھے، تاریخ سے واقفیت میں علامۂ زمانہ تھے، فن قرات اور لغت وغیرہ میں بھی دستگاہ کامل حاصل تھی۔

نیز لکھتے ہیں: وكان من أفراد الدهر علما، وذكاء، وكثرة تصانيف. قل أن ترى العيون مثله (٦).

وہ علم فضل اور ذہانت وذکاوت اور کثرت تصانیف میں یکتائے روزگار تھے۔ نگاہوں نے ان کی مثال کم دیکھی ہے۔

کثرتِ تصانیف کی بات آئی، تو یہ بھی معلوم ہو کہ چالیس سال ان کی زندگی کے ایسے گزرے ہیں کہ وہ روزانہ چالیس ورق لکھتے تھے (۷)۔

امام ابن جریر طبری کی وسعت علمی اور عالی ہمتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے تاریخ اور تفسیر میں کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو اپنے تلامذہ کے سامنے یہ بات رکھی کہ تم تاریخ عالم کے لیے کتنے مستعد ہو، جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے زمانے تک کے حالات ہوں گے؟ انھوں نے عرض کیا: اس کی ضخامت کیا ہوگی؟ امام طبری نے کہا: تیس ہزار اوراق، یعنی ساٹھ ہزار صفحات میں یہ کتاب ہوگی۔ شاگرد کہنے لگے: اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی عمریں ختم ہو جائیں گی۔ انھوں نے اس پر انا للہ پڑھا اور فرمانے لگے: ہمتیں مر چکیں، حوصلے فنا ہو چکے ہیں! پھر انھوں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے تین ہزار ورق یعنی چھ ہزار صفحات میں اس کو لکھا۔ اسی طرح جب انھوں نے تفسیر لکھوانے کا ارادہ کیا تو اپنے شاگردوں سے اسی طرح کا سوال کیا اور اسی طرح جواب ملنے پر اس کو تقریباً تاریخ کی کتاب کے بقدر ہی مختصر لکھا۔

جہاں تک تفسیر ابن جریر کا تعلق ہے، وہ ایک بے نظیر کارنامہ اور انقلابی کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن جریر کے زمانے تک اور ان کے بعد ایک عرصے تک لوگ اپنی تفسیروں میں صرف حدیث کی روایتیں اور صحابہ وتابعین کے آثار نقل کرتے تھے، امام ابن جریر نے بڑی جرأت سے کام لے کر اس ڈھرے کو چھوڑا اور ایک نئی راہ نکالی، اور امت کو قرآن کریم پر غور کرنے کا ایک منہج دیا۔ وہ روایتیں بھی بڑی فراوانی سے نقل کرتے ہیں، لیکن اس پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں، اور بڑی قوت سے کلام کرتے ہیں، اور پوری فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔

تفسیر طبری کا منہج اور خصوصیات

تفسیر طبری کا منہج اگر بیان کیا جائے تو مندرجۂ ذیل تفصیل سے بات سامنے آسکتی ہے:

۱۔ کسی آیت یا آیت کے کسی ٹکڑے کی توجیہ میں جتنی مرفوع، موقوف، مقطوع روایتیں ان کو پہنچی ہیں، ان سب کو اپنی سند سے نقل کرتے ہیں، اس میں بقول امام ابن تیمیہ: اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ متہمین کی روایتیں نہیں

لیتے، جیسے مقاتل بن بکیر اور کلبی (۸)۔

روایات نقل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی طرف سے عنوان اس طرح قائم کرتے ہیں:

القول في تأويل قوله عز وجل، پھر اس طرح روایتیں نقل کرتے ہیں: كالذي حدثني ---یا ذكر من قال ذلك، اور پھر کوئی اختلاف ہو تو نقل کر کے اس کی تائید میں روایتیں نقل کرتے ہیں، کبھی بات کے آغاز کے ساتھ ہی کہتے ہیں: اختلف أهل التأويل في تأويل ذلك، پھر فقال بعضهم کہہ کر معنی لکھتے ہیں اور تائید میں ذكر من قال ذلك کہہ کر روایتیں نقل کرتے ہیں، اس کے بعد دوسرے معنی لکھ کر اسی طرح روایتیں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ مفردات کے معانی، ماہرینِ لغت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، اور اس میں بھی نقلِ محض پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اگر یہ معنی نامناسب ہیں تو شدید تنقید کر کے اس کے صحیح معنی بیان کر کے دلیل دیتے ہیں؛ چناں چہ انھوں نے معنی کی توضیح اور اصل حقیقت تک رسائی کے لیے اشعارِ عرب کا بہت سہارا لیا ہے۔

۳۔ نحو اور وجوہِ اعراب کو اہتمام سے بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی اپنی فنی مہارت کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔

۴۔ امام ابن جریر، دوسرے علوم میں مہارت کے ساتھ فن قرأت کے بھی امام تھے، اس لیے اختلافِ قرأت کو نقل کر کے صحیح معنی کے پیش نظر ایک قرأت کو دوسری پر ترجیح بھی دیتے ہیں، هذه القراءة أولى بالصواب، القراءة التي لا أستجيز غيرها هي كذا، یا أولى التأويلين بالآية وأصح القراءتين في التلاوة عندي التأويل الأول وغیرہ تعبیرات سے اپنی امامت کا لوہا منواتے ہیں۔

۵۔ دوسروں کی آراء نقل کر کے ان سے اختلاف کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اپنی رائے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ طبری کی رائے ہی صحیح ہے۔

۶۔ امام طبری اگرچہ اصلاً شافعی تھے، لیکن منصبِ اجتہاد پر فائز تھے، اس لیے فقہی احکام بیان کرنے میں ان کی اجتہادی شان صاف معلوم ہوتی ہے۔

۷۔ عقائد میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کی پوری ترجمانی کی ہے، اور باطل عقائد بالخصوص معتزلہ کے عقائد کی سختی سے تردید کی ہے۔

۸۔ بے فائدہ اور غیر ضروری امور کو نہیں چھیڑتے، جیسا کہ بعض مفسرین کی عادت ہوتی ہے، جیسے اصحاب کہف کے نام کیا تھے؟ یا مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے آسمان سے جو مائدہ اترا تھا، اس میں کس قسم کا کھانا تھا؟ یا مثلاً حضرت آدم وحوا کو جنت میں کس درخت سے روکا گیا تھا؟ اس سلسلے میں چند روایتیں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ایک غیر ضروری بحث ہے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ ایک مخصوص درخت تھا، اگر اس کی تعیین مقصود ہوتی تو اللہ ضرور بتاتا (۹) وغیرہ وغیرہ۔

۹۔ اسرائیلی روایات سے جب قصے نقل کرتے ہیں تو تنقید کا فریضہ انجام دیتے ہیں؛ تاہم بعض اسرائیلی

روایتوں کو بغیر نقد کے بھی انھوں نے نقل کیا ہے۔

غرض امام ابن جریر کا کام تفسیر کے میدان میں ایک انقلابی قدم ہے، بلکہ ایک تجدیدی کارنامہ ہے۔ باذوق لوگوں کو اس تفسیر سے خصوصی استفادہ کرنا چاہیے۔

تفسیر طبری کا مقام علماء کی نظر میں

امام الائمہ ابن خزیمہ (ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ السلمی النیساپوری المتوفی ۳۱۱ھ) نے اس کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد کہا: ہمیں نہیں معلوم کہ روئے زمین پر ابن جریر سے بھی بڑا کوئی عالم ہے! (۱۰)

امام ابن جریر کے شاگرد ابومحمد الفرغانی (عبداللہ بن احمد المتوفی ۳۶۲ھ) تفسیر ابن جریر کے بارے میں فرماتے ہیں: اگر کوئی عالم یہ دعویٰ کرے کہ وہ تفسیر ابن جریر سے دس کتابیں تیار کرے گا اور ہر کتاب میں کسی ایک علم کا مکمل بیان ہوگا، تو وہ یہ کرسکتا ہے۔ (۱۱)

ابوحامد اسفرائنی (احمد بن محمد المتوفی ۴۰۶ھ) نے اس کی اہمیت کا اس طرح اعتراف کیا ہے کہ اگر کوئی ابن جریر کی تفسیر حاصل کرنے کے لیے چین تک کا سفر کر ڈالے تو بھی اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا (۱۲)۔

خطیب بغدادی (ابوبکر احمد بن علی ثابت المتوفی ۴۶۳ھ) کا قول گزر چکا ہے: لم یصنف أحد مثله (۱۳) یعنی کسی نے تفسیر میں ایسی کتاب نہیں لکھی۔

امام سیوطی (عبدالرحمن بن أبي بکر المتوفی ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:

كتابه أجل التفاسير وأعظمها .... فإنه يتعرض لتوجيه الأقوال، وترجيح بعضها على بعض، والإعراب والاستنباط، فهو يفوقها بذلك (۱۴).

تفسیر طبری کی طباعتیں

اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر طبری کی اشاعتوں پر بھی ایک نظر ڈالی جائے:

اس کی پہلی اشاعت نو جلدوں میں مطبعہ میمنیہ مصر سے ۱۳۲۱ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد مختلف مکتبوں کی طرف سے اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ مشہور مصری فاضل محقق دوراں اور محدث زماں علامہ احمد شاکر (متوفی ۱۹۵۸ء) نے جو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، ان میں ایک بڑا کارنامہ تفسیر طبری کی تحقیق وتخریج بھی ہے، لیکن ان کے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی مکمل نہ ہوسکا، ۱۳۷۴-۱۳۸۸ھ تک اس کی سولہ جلدیں شائع ہوئیں (دار المعارف، مصر)، سولہویں جلد سورۂ ابراہیم کی ستائیسویں آیت پر ختم ہوتی ہے، تخریجِ احادیث کا کام انھوں نے کیا، اور تحقیقِ متن کی خدمت ان کے برادر خورد شیخ محمود شاکر نے انجام دی، کچھ عرصے پہلے ۳۰/اجزا میں دار إحیاء التراث العربي، بیروت۔ لبنان نے اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا (تاریخ ندارد)، اس میں ضبط وتعلیق محمود شاکر کا لکھا ہوا

ہے، تخریج حدیث کا نام ونشان نہیں، کہیں کہیں کچھ تعلیقات ہیں، اور مقدمہ میں بھی شیخ احمد شاکر کے کام کا کہیں ذکر نہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ شیخ محمود شاکر نے شیخ احمد شاکر کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے تخریج کا کام بھی مکمل کیا ہے، اور یہ ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

اس کا سب سے اچھا اور محقق ایڈیشن جس میں تخریج حدیث پر بھی پوری توجہ دی گئی ہے، شیخ عبداللہ بن عبد المحسن الترکی کی تحقیق کے ساتھ دار عالم الکتب، الریاض نے ۲۶ ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے، جن میں دو جلدیں فہارس کی بھی شامل ہیں (طبع اول ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)۔

حواشی:

(۱) العجاب في بيان الأسباب (۱/ ۲۰۲-۲۰۳) تحقیق د.عبدالحكيم الأنيس، دار ابن الجوزي السعودية، ۱۴۲۸ھ/۱۹۹۷م۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب تفسیر واصول تفسیر-تعارف، ضرورت اور اہم کتابیں، ص: ۴۰-۴۲

(۲) معجم الأدباء = إرشاد الأريب إلى معرفة الأديب (۶/ ۲۴۵۲) لياقوت الحموي، تحقيق إحسان عباس، دار الغرب الإسلامي بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳م

(۳) تاريخ بغداد (۲/ ۱۶۱) دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان

(۴) سير أعلام النبلاء (۱۴/ ۲۷۰) مؤسسة الرسالة، بيروت-لبنان

(۵) أيضاً ۱۴/ ۲۶۷

(۶) المنتظم (۱۳/ ۲۱۶) لابن الجوزي، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲م

(۷) تاریخ بغداد (۲/ ۱۶۱) نیز دیکھیے سیر أعلام النبلاء (۱۴/ ۲۷۴-۲۷۵)

(۸) مجموعة فتاوى ابن تيمية (۱۳/ ۳۸۵)

(۹) دیکھیے تفسیر الطبری (۱/ ۵۵۶)

(۱۰) تاریخ بغداد (۲/ ۱۶۴)

(۱۱) سیر أعلام النبلاء (۱۴/ ۲۷۳)

(۱۲) طبقات الشافعیہ للسبکی (۳/ ۱۲۳) معجم الأدباء للحموی (۱۸/ ۴۲)

(۱۳) تاریخ بغداد (۲/ ۱۶۳)

(۱۴) الإتقان في علوم القرآن (ص: ۸۸۳)، تحقيق: فواز أحمد زمرلي، دار الكتاب العربي بيروت، ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵م

اجتہاد وتقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(سابق ناظم ندوۃ العلماء)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا، وہ متوازن ومعتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے، جو انہوں نے اجتہاد وتقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کی طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ عامی ہو یا خاص براہ راست کتاب وسنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلف قرار دیتے تھے، اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزمؒ پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا، اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام ''فاسق'' اور ''ضال'' سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا تھا کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خودرائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار اور فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت ونظم پیدا کرنے، اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقع دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے، لیکن انہوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دے دیا، اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا، اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں، اور بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں عبادات ومعاملات میں جو نئے نئے مسائل ومشکلات پیش آتے تھے، ان کو وہ کس طرح حل کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں وہ کیا راستہ اختیار کرتے تھے، ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے باب ''حكاية حال الناس قبل المأة الرابعة وبعدها'' (چوتھی صدی ہجری سے پیشتر اور اس کے بعد کے لوگوں کا مسائل دینی کی تحقیق وعمل کے بارے میں کیا طرز

عمل تھا؟) میں تحریر فرماتے ہیں:

’’معلوم ہونا چاہئے کہ چوتھی صدی سے قبل کے لوگ کسی ایک معین مذہب (فقہی) کی پابندی اور اس کی مکمل تقلید پر اجماع کیے ہوئے نہیں تھے، ابو طالب مکی (اپنی مشہور کتاب) ’’قوت القلوب‘‘ میں لکھتے ہیں: کہ تصنیفی انداز کی کتابیں (اور فقہی مسائل کے مجموعے) اس زمانہ کے بعد کی باتیں ہیں، لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کا کہنا کسی ایک مذہب پر فتوی دینا، اس کے قول کو دستور العمل بنالینا اور اس کو نقل کرنا اور اسی مذہب کے اصولوں اور بنیادوں پر تفقہ کا پہلی اور دوسری صدی میں وجود نہیں تھا۔

میں اس میں اضافہ کرکے کہتا ہوں کہ دو ابتدائی صدیوں کے بعد تخریج کا کسی قدر سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ چوتھی صدی کے لوگ ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر تقلید خالص کے پابند اور اسی کے مطابق مسائل واحکام میں تفقہ اور اسی مذہب کے تحقیقات واجتہادات کی نقل وروایت کے عادی نہیں تھے، جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔

امت اور (مسلم معاشرہ میں) دو طبقے تھے ایک علماء کا ایک عوام کا۔ عوام کا تو قصہ یہ ہے کہ وہ ان اجماعی مسائل میں جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ صرف صاحب شرع (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تقلید کرتے تھے، وہ وضوء، غسل کرنے اور نماز وزکوۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اسی طرح کی عبادات وفرائض، اپنے والدین یا اپنے شہر کے استادوں، عالموں سے اخذ کرتے تھے، اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، اور اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے بھی جس تک ان کی رسائی ہوتی تھی، کسی خاص مذہب کے تعین کے بغیر رجوع کر لیتے تھے، اور اس سے مسئلہ پوچھ لیتے تھے، جہاں تک خواص کا تعلق ہے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ جن کا فن حدیث تھا، وہ حدیث سے اشتغال رکھتے تھے، ان کو احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آثار صحابہ کا اتنا ذخیرہ مل جاتا تھا، کہ اس کی موجودگی میں ان کو اس مسئلہ میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ان کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی حدیث جو درجۂ شہرت، استفاضہ یا صحت کو پہنچی ہوتی تھی، یا صحیح حدیث ہوتی تھی، موجود تھی، جس پر فقہاء اور علمائے کبار میں کسی نہ کسی نے عمل کیا ہوتا تھا، اور کسی کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوتا تھا، یا جمہور صحابہؓ اور تابعین کے پے در پے ایک دوسرے کی تائید کرنے والے اقوال ان کے پاس ہوتے تھے، جن سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، اگر ان میں سے کسی کو مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے اس کا قلب مطمئن ہوتا، نقول کے تعارض یا ترجیح کے اسباب کے عدم وضاحت کی وجہ سے یا کسی اور معقول سبب سے تو پھر وہ اپنے پیشرو فقہاء اور علماء کے کلام کی طرف رجوع کرتا تھا، اگر اس کے بارے میں اس کو دو قول ملتے تو ان میں سے وہ اس کو اختیار کر لیتا جو زیادہ قوی اور مدلل ہوتا، چاہے یہ قول علمائے مدینہ کا ہوتا، یا علمائے کوفہ کا، جو تخریج (اجتہاد واستنباط) کی اہلیت رکھتے تھے، وہ ایسے

مسئلہ میں جس میں ان کو کوئی صراحت نہیں ملتی تھی تخریج و اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اساتذہ یا اہل گروہ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی، علمائے حدیث میں بھی جو کسی مذہب سے زیادہ اتفاق کرتا تھا، اس کی طرف منسوب ہو جاتا تھا، مثلاً نسائی اور بیہقی کی نسبت امام شافعی کی طرف کی جاتی تھی، اس زمانہ میں قضاء و افتاء پر اسی کا تقرر کیا جاتا تھا، جس میں اجتہاد کی صلاحیت ہوتی تھی، فقیہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہوتا، پھر ان صدیوں کے بعد دوسری طرح کے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے چپ وراست کا راستہ اختیار کیا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۲۔ ۱۵۳)

تقلید کی جائز اور فطری شکل

شاہ صاحبؒ غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبوی ﷺ ہے، لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب وسنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہنچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کیلئے وقت وفرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم وتحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلا لے، یا ان سے مسئلہ استنباط کر لے، شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزمؒ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کر لے، تحریر فرماتے ہیں:

''ابن حزمؒ کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت ﷺ (کے اقوال واحوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی ﷺ کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا، اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا؟

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی ﷺ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتوی لیتا ہے، یا کبھی ایک سے فتوی لیتا ہے کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے، اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟

جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری، اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور یہ کہ وہ معصوم ہے تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بناء پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں، یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے، یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے، اس بناء پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے، وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے، اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آں حضرت کی طرف کی جاسکتی ہے، لیکن ظنی طریقہ پر، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم ﷺ جن کی طاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابل وثوق سند سے پہنچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو، اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں، تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟'' (حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۵۵-۱۵۶)

مذاہب اربعہ کی خصوصیت

اس منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کے بعد شاہ صاحب ان چار فقہی مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے بارے میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جارہا ہے، اپنے رسالہ ''عقد الجيد في أحكام الاجتهاد و التقليد'' میں جو ''بہ قامت کہتر بقیمت بہتر'' کا مصداق ہے تحریر فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے، اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر وعلی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشرووں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے، اور نقل جب ہی ممکن ہے، جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدین کے مذاہب معلوم ہوں تا کہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرق اجماع نہ ہو جائے، اس لیے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صَرف، نحو، طب، شاعری، لوہاری تجاری، رنگ ریزی، سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی

صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگر چہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہوگئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے، تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی، مشہور کتابوں میں مدون ہوں، اوران پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے، وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوام میں تطبیق دی جا چکی ہو، اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جا چکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب واجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ صفات پائے جاتے ہوں، اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔" (عقد الجید ص ۳۴-۳۸)

اس طرح شاہ صاحب نے اجتہاد وتقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے، جو مقاصد شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے، انہوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع اور کتاب وسنت کی پیروی ہے اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنا رہے ہیں، وہ کتاب وسنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا محض نمائندہ اور ترجمان ہے، نیز یہ کہ ذہن اس کیلئے تیار رہے، (خواہ اس کا موقع مدتوں میں آئے) کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائے گا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے، اور سنت سے ثابت حکم دوسرا ہے تو ایک صاحب ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوکَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيماً (سورہ نساء: ۶۵)

(ترجمہ) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اور ان کی عظمت کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اور اس فقہی وحدیثی ذخیرہ کو بیش قیمت اور قابل استفادہ قرار دیتے ہوئے اور اس سے بے نیازی واستغناء کو مضر و محرومی کا سبب مانتے ہوئے شاہ صاحب اس کے قائل ہیں کہ اجتہاد (اپنی شرطوں اور ضروری احتیاطوں کے ساتھ) ہر دور کی ضرورت، حیات انسانی اور تمدن ومعاشرت کی تغیر پذیری، اور نمو وارتقا کی صلاحیت اور انسانی ضروریات، حوادث و تغیرات کے تسلسل کا فطری تقاضا اور شریعت اسلامی کی وسعت، اس کے من جانب اللہ ہونے اور قیامت تک

انسانوں کی رہنمائی اور معاشرہ کے جائز تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت ہے، جس کا اظہار اور ثبوت ہر دور میں ضروری اور حاملین شریعت کا فرض ہے۔

مقدمہ مصطفی میں لکھتے ہیں:

''اجتہاد ہر زمانہ میں فرض بالکفایہ ہے، یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں، جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا، جو جرح و تعدیل، زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے، اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے، مقصود اجتہاد منتسب ہے، اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

اور ہم جو یہ کہتے کہ اجتہاد اس زمانہ میں فرض ہے (اور یہ محققین اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصر ممکن نہیں، اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے، اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں، جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں، ان میں اکثر میں انقطاع ہے کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کرسکتا، اس لیے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کیے اور تحقیق کیے بغیر معاملہ بنتا نہیں۔'' (مقدمہ مصفے (فارسی) ص ۱۲ مطبع فاروقی دہلی۔

شریعت کے مقاصد اور مصالح

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ
(سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

فقہی اختلاف کیوں؟

فقہ اسلامی کے سلسلہ میں سبھی یہ جانتے ہیں کہ وہ مختلف مذاہب پر مشتمل ہے جس کے مابین اختلافات ہیں، ایسا کیوں ہے، شریعت اسلامی جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اللہ رب العزت کی دی ہوئی ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا، انسان کی خصوصیات اس نے متعین فرمائی، انسان کی ضروریات بھی اس کی متعین کی ہوئی ہیں، تو وہ جانتا ہے کہ انسان کی کیا ضروریات ہیں، اور اس کی طاقت اور صلاحیت کتنی ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے جو شریعت انسان کو عطا فرمائی اس میں انسان کی ضروریات وخصوصیات کی رعایت رکھی، اس لئے کہ وہ دین فطرت ہے، دین فطرت کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں کی اور فطرت کی جو دشواریاں ہیں ان کی رعایت کی گئی ہیں، ورنہ وہ دین فطرت نہیں ہوسکتا، تو شریعت جو اللہ تعالی نے مقرر فرمائی اور وہ قیامت تک کے لئے ہے، اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، جو قیامت تک چلے گی، تو اس شریعت میں اختلاف کیسے، اور اگر اختلاف ہے تو اس میں کوئی مصلحت ہوگی، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی شریعت ہے، اس میں عیب نہیں ہوسکتا، یہ اختلاف کیوں ہے؟

دراصل یہ اختلاف حقیقت میں فطرت کے مطابق ہے، اس لئے کہ انسان مزاجوں کے اعتبار سے، اپنے مقام کے اعتبار سے اور اپنے دیگر حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق رکھتا ہے، انسان کی خصوصیات میں فرق ہوتا ہے، اس کے مزاج میں، اس کی برداشت میں فرق ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا، سمجھئے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک انعام ہے کہ اس نے جو شریعت ہم کو دی ہے اس میں انسانوں کے حالات وضروریات کے لحاظ سے گنجائش رکھی ہے، آپ دیکھئے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ گائے ذبح کریں، ان کو اس میں اختیار حاصل تھا کہ اس حکم پر جس طرح عمل کرنا ان کے لئے آسان تھا کر لیتے لیکن انہوں نے بار بار سوال سے اپنے عمل کا دائرہ تنگ کرلیا، یہ گائے کیسی ہو، رنگ کیسا ہو، وہ جتنا پوچھ سکتے تھے پوچھتے چلے گئے، ان کے پوچھنے پر اللہ تعالی نے دیکھا کہ وہ اپنے

اوپر پابندی بڑھانا چاہ رہے ہیں، لہذا پابندیاں بڑھادیں کہ اس طرح کرو، اس طرح کرو، پھر وہ دشواری میں پڑ گئے، ان کو وہ گائے تلاش کرنا ایک بڑی مصیبت کا باعث بن گیا، بڑی مشکل سے وہ گائے ملی، اسی لئے شریعت میں کہا گیا: لا تسئلوا عن أشياء إن تبدلكم تسؤكم اس لئے یہ ہدایت دی گئی کہ تم کو جو بتادیا گیا ہے، اس سے تم اخذ کرلو، پوچھ پوچھ کر تم اپنے کو تنگی میں مبتلا مت کرو تو میں یہ سمجھتا ہوں، آسانی پیدا کرنے کے لئے اختلاف کی گنجائش رکھی گئی، اور وہ اللہ تعالی کی طرف سے کی گئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گنجائش کو قائم رکھا، چنانچہ مختلف معاملات میں یہ جو مختلف آراء قائم ہوئی ہیں، مختلف مذاہب بنے ہیں، یہ انسانی ضرورت اور انسانی دشواریوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

مختلف مسالک میں علاقوں کی مناسبت

میں نے اپنے بعض مضامین میں اس سلسلہ میں عرض کیا کہ آپ دیکھئے جو مذاہب دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہیں، تو وہ مذاہب (مذاہب سے مراد فقہی مذاہب ہیں) آپ دیکھئے کہ ان میں اپنے اپنے علاقوں سے مناسبت ہے، یہ خاص بات ہے، مثلا پانی ہی کو لے لیجئے، جن علاقوں میں پانی کی بہتات ہے، وہاں عام طور سے آپ کو فقہ حنفی کے ماننے والے ملیں گے، اور جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے وہاں آپ کو فقہ مالکی کے ماننے والے ملیں گے، اور دونوں میں آپ دیکھئے کہ پانی کے سلسلہ میں دونوں کے مسلک الگ الگ کیا ہیں، اگر ہم اپنے علاقہ کے لحاظ سے فقہ مالکی کو دیکھیں تو فقہ مالکی کا وہ مسلک عجیب سا معلوم ہوگا، وہاں پانی کے معاملہ میں بڑا توسع ہے، جو لوگ مغرب میں گئے ہوں گے، الجزائر یا مراکش تو معلوم ہوگا کہ ان علاقوں میں پانی کے حصول میں کمی ہے۔

فقہ مالکی میں طہارت سے متعلق مسائل کے مصالح

میں اپنا واقعہ بتاتا ہوں کہ میں الجزائر گیا ہوا تھا، انہوں نے ایک شہر میں فنکشن رکھا تھا، عصر کے وقت میں وہاں پر گیا۔ میں نے نماز نہیں پڑھی تھی اور استنجاء کی بھی ضرورت تھی، میں نے کہا: مجھے وضو کرنا ہے، تو وہ مجھے ایک جگہ لے گئے، استنجاء خانہ میں نل لگا ہوا تھا اور اس کے نیچے بالٹی رکھی ہوئی تھی، اور کچھ نہیں تھا، بالٹی میں پانی بھرا تھا، اب ایک تو یہ کہ بالکل استنجاء خانہ کے سامنے پانی سے بھری بالٹی رکھی ہوئی تھی، اور ہم لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں چھینٹیں بھی جاسکتی ہیں، پھر پانی نکالنے کی کوئی چیز نہیں تھی، کوئی مگ، یا کوئی گلاس نہیں تھا، تو مجھے یاد آیا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: پانی کو اچل اچل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا، پہلے اس کو ٹیڑھا کر کے اپنا دایاں ہاتھ دھولیا، اور پھر اسی سے اچل اچل کر پانی کو استعمال کرلیا، مجھے خیال آیا کہ ان کے یہاں اسی پر عمل ہوتا ہے، میں نے اس پر عمل کیا اور عمل ہوگیا، وہاں سے نکل کر باہر آیا اور کہا کہ مجھے وضو کرنا ہے تو ایک بالٹی بھر کر انہوں نے رکھ دی، کوئی مگ نہیں، کوئی اور دوسری چیز نہیں، تو میں نے سوچا کہ اس پر عمل کرنا پڑے گا، چنانچہ میں نے وہی کیا کہ پہلے ہاتھ کو دھویا ٹیڑھا کر کے

اور پھر وضو کیا، یہ تو میرے ساتھ پیش آیا لیکن ان کی زندگی میں یہ چیز داخل ہے، اس طرح پانی کم بھی صرف ہوتا ہوگا۔

ایک سفر میں حضرت مولانا (سید ابوالحسن علی ندوی) کے ساتھ گیا، مولانا کو طہارت وغیرہ کا بڑا لحاظ ہوتا تھا، مولانا نے کہا کہ یہاں غسل خانہ میں کوئی چیز نہیں ہے، کیسے پانی استعمال کریں، کہیں سے لوٹا لا یا جائے یا کوئی اور چیز، تو میزبان بہت پریشان ہوئے، کہاں سے لائیں، آخر بڑی مشکل سے ایک بڑی سی چائے دانی لا کر دی، وہ رکھی گئی اور اس سے لوٹے کا کام لیا گیا، تو یوں کہنے کو تو میں اور آپ ان پر تنقید کر سکتے ہیں لیکن نہیں، آپ دیکھئے ان کو کہ انہوں نے حدیث شریف سے اس کا استنباط کیا اور وہ استنباط صحیح ہے، کہ حضرت محمد جب تھوڑے پانی میں کام چلا لیتے ہیں، غسل فرما لیتے ہیں تو ہم کون بڑے پاک صاف آدمی ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے لیکن ہم نہیں کرتے، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے، ایک لگن میں پانی رکھ دیا جائے اور کہا جائے کہ تم غسل کر لو تو اس کا منھ دیکھنے لگیں گے جو یہ کہے گا، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے، اور آپ ﷺ ہی نہیں، بلکہ حضرت عائشہ بھی غسل کر لیتی تھیں، تو آپ دیکھئے ہمارے یہاں پانی کی بہتات ہے، آسانی ہے، لہذا طہارت کے معاملہ میں غلو پیدا ہو گیا، اور وہ مسلک ہم کو زیادہ موافق معلوم ہوا، جس میں پانی کے استعمال میں طہارت کی زیادتی اختیار کی گئی، لیکن ان کو پانی کے حصول میں وہاں دشواری ہوئی تو ان لوگوں کو وہ مسلک زیادہ موافق معلوم ہوا، جس میں پانی کی طہارت میں زیادہ توسیع ہوا۔

مذاہب کے درمیان اختلاف رحمت ہے

لہذا یہ جو مذاہب کے درمیان اختلاف ہے درحقیقت یہ رحمت ہے، ورنہ اگر ہر معاملہ میں کوئی ایک پہلو متعین یا کوئی ایک چیز سب کے لئے لازمی قرار دے دی گئی ہوتی تو کیا ہوتا آپ سوچئے، آدمی کر تو لیتا، لیکن مشکل پیش آتی، اسی طرح آپ دیکھئے کہ فقہ شافعی ہے، زیادہ تر ساحلی علاقہ میں اس مسلک کو رائج دیکھیں گے، جہاں سمندر کی چیزیں استعمال کرنے کی آسانی ہے، اور فقہ شافعی میں سمندر کی چیزوں کے استعمال میں توسع ہے، جو فقہ حنفی میں نہیں ہے، اگر یہ مسلک وہاں نافذ کر دیا جائے اور ان کا مسلک ہمارے یہاں نافذ کر دیا جائے تو عجیب سا معاملہ ہوتا، آسانی کم ہوتی اور "الدین یسر" کے مطابق نہ ہوتا اور یہ مسلک بنے کیسے! اگر گنجائش نہ ہوتی تو یہ نہیں بن سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ سہولت اللہ تعالی کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کے ذریعہ سے دی گئی ہے، دراصل اللہ تعالی کی طرف سے یہ گنجائش دی گئی ہے اور جو منع کیا گیا ہے کہ "لا تسئلوا عن أشياء إن تبدلكم تسؤكم میں اس سے بھی اشارہ ملتا ہے، پوچھ کر آپ اپنے لئے تنگی کیوں پیدا کریں، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو مخفی رکھا ہے جس چیز کو چھوڑ دیا ہے ہماری سمجھ پر، اس کو متعین کر کے اپنے لئے دشواری کیوں پیدا کریں، ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے شریعت میں بہت سی چیزیں انسان کی سمجھ پر چھوڑی گئی ہیں، اور بہت سی چیزوں کے متعلق واضح حکم ہے، صراحت کے ساتھ حکم ہے، اور بہت سی چیزوں کو انسان کی سمجھ پر چھوڑا گیا ہے، اور وہ چیزیں وہ ہیں جو انسان کی سمجھ کے اس دائرہ میں آتی ہیں جو

شریعت سے ٹکراتی نہیں ہیں، کہ جو ایسے احکام ہیں ان احکام کی فضا میں، ان کی روشنی میں انسان کی سمجھ اس طرف جائے گی جس کو شریعت چاہتی ہے۔

شریعت میں انسانی مصالح کی رعایت

جہاں تک مقاصد کا مسئلہ ہے، تو آدمی مقاصد سے واقف ہے تو غلط راہ پر جا ہی نہیں سکتا، مقصد خود متعین کر دے گا کہ آپ اس راہ پر چلیے، اس راہ سے آپ ہٹ نہیں سکتے، مجبور ہیں، اس تناظر میں یہ سیمینار بہت اہمیت رکھتا ہے، جب تک ہم مقاصد شریعت سے واقف نہیں ہوں گے، ہم شریعت کا پوری طرح تعین نہیں کر سکتے، ہم غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے، ہمارے پاس جو نصوص ہیں اگر ان نصوص کے صرف ظاہر کو ہم دیکھ کر اور اسی کے دائرہ میں رہ کر فیصلہ کریں گے تو مختلف ایسے پہلو ملیں گے جہاں ہمیں دشواری ہو جائے گی، وہاں وہ نصوص منطبق ہوتے نہیں معلوم ہوں گے، اب مثلاً آپ دیکھئے مسلکوں میں فرق ہے، رفع یدین کا، آمین بالجہر کا، اور سب حدیث شریف سے ہی اخذ کرتے ہیں، چاروں مسلک حدیث شریف سے ہی اخذ کرتے ہیں، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا حکم ہو اور واضح نہ ہو، ایسا نہیں ہوسکتا مصلحت بعض احکام میں گنجائش کی ہوتی ہوگی، جب دونوں چیزیں حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ میں ملتی ہوں تو مسئلہ اس کی تطبیق کا ہے، اس کی تطبیق کیسے کی جائے، یہ انسان کی دینی فہم پر چھوڑا گیا ہے، انسان کی ایک دینی فہم ہے، ایک دنیاوی فہم ہے، انسان اپنی ضرورت کے لحاظ سے، اپنی مصلحت کے لحاظ سے اپنا ذہن چلاتا ہے، اور دین کے معاملہ میں دین کو سامنے رکھ کر، دین کے مقاصد و مصالح کو سامنے رکھ کر اور دین کے مزاج کو سامنے رکھ کر اس کا ذہن چلتا ہے، آپ دینی ذہن اختیار کریں تو وہ آپ کو اسی راہ پر لے چلے گا جو صحیح راہ ہے، تو یہ جو اختلاف ہے اگر مقاصد متعین ہیں تو یہ اختلاف انسان کے لئے نعمت کا باعث ہے، اور اس میں ایک مسلک حق کے لوگ دوسرے مسلک حق کے لوگوں کو روک نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ مسلک اس کے ماننے والوں کی دینی سمجھ کے لحاظ سے شریعت کے مقصد کے زیادہ مطابق اور حالات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اس کے اندر گنجائش رکھی گئی ہے اس گنجائش کے مطابق وہ اختلاف بے مقصد نہیں، کیوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دین جو قیامت تک کے لئے آیا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، اس کے اندر خلل ہو، خلل ہو ہی نہیں سکتا، جو ہمیں خلل نظر آرہا ہے، وہ گنجائش ہے جس کو ہماری مصلحت سے رکھا گیا ہے، اس میں اختلاف کا جو موقع رکھا گیا ہے وہ اس لئے کہ اس موقع سے ہم فائدہ اٹھاسکیں، ہمارے حالات بدل سکتے ہیں، ہماری ضروریات بدل سکتی ہیں، ماحول کے ساتھ اور زمانہ کے ساتھ ہماری ضروریات بدل جاتی ہیں، اور آپ دیکھئے بعض چیزوں کی صراحت آئی ہے، مثلاً مرض میں وضو اور طہارت کا حکم بدل جاتا ہے، اسی طرح سفر میں قصر کی اجازت مل جاتی ہے، یہ تو ایسا ہے کہ اس کا حکم واضح طریقہ سے آگیا، لیکن یہ فرق کیوں ہے، اس لئے کہ مسافر کو دشواری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دشواری کا

حل بتادیا، اوراسی طرح مریض کے لئے پانی کا استعمال مرض کو بڑھا دیتا ہے، اس لئے اللہ تعالی نے اس کے لئے سہولت رکھ دی، اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ دے دیا کہ دیکھو اللہ تعالی تمہاری راحت، تمہاری استطاعت کا لحاظ رکھتا ہے، اوراس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ مذہب فطرت کے مطابق ہے، اس میں رعایت رکھی گئی ہے، انسان کی مشکلات کی، انسانوں کی ضروریات کی رعایت رکھی گئی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالی نے یہ رعایت رکھی ہے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ جوفرق ہے سمجھنے کا اس میں اس رعایت کی وجہ سے ہے، اوراللہ تعالی کی طرف سے خود اس بات کی اجازت ہے کہ جو چیز ہمارے لئے زیادہ موافق ہے اور شریعت میں اس کی گنجائش ہے، اس میں ہمیں نص مل رہا ہے، تو ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، تو ان سب چیزوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس میں انسان کی ساری ضروریات اوراس کی مشکلات کا حل رکھا گیا ہے اور یہ کہ یہ مشکلات اور یہ ضروریات صرف ایک ہی زمانہ کیلئے نہیں ہے، بلکہ قیامت تک کیلئے ہے۔

نصوص میں وسعت اور تنوع

آپ دیکھئے کہ جب اسلام آیا تو اسلام سب سے پہلے عربوں کے پاس آیا جو جاہل قوم تھی، جہالت تھی ان میں، نہ وہ علوم سے واقف تھے، نہ ان میں تمدن تھا، دیہاتی زندگی ان کی تھی لیکن اللہ تعالی نے جو دین عطا فرمایا، جو احکام عطا فرمائے اس حالت میں کہ وہ امی تھے، لیکن احکام کے اندر اتنی گنجائش تھی کہ تمدن آنے پر تمدن کی ضرورت پوری کی، تمدن کی ضرورت اس نے کیسے پوری کی، وہ انسان کی دینی فہم کے ذریعہ سے، عہد عباسی میں جب تمدن پوری طرح چھا گیا وہ تمدن کہاں سے آیا؟ اس کے کچھ حصے تو ایران سے آئے، کچھ حصے یونان سے آئے، یونان، ایران، ہندوستان، قرب و جوار کے جو متمدن علاقے تھے، کچھ چیزیں وہاں سے آئیں، تو عربوں کا جو تمدن بنا وہ ان ساری چیزوں کے استفادہ سے بنا، اور خود عربوں کا جو مزاج تھا اس نے مدد کی، یہ دین کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گئے تھے امی ہونے کے زمانہ میں دیے گئے تھے، وہ عہد عباسی میں آکر ایسا وسیع اور ایسا جامع دین کی حیثیت سے سامنے آیا کہ وہ دین انسان کے تمدن کی ساری ضرورتوں کو بخوبی پورا کرسکا اور برابر پورا کرتا رہا۔ ان کی سیاست کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، ان کی مالیات کی ضروریات کو پورا کرتا تھا لیکن یہ کیسے ہوسکا، یہ ان علماء کی محنتوں سے ہوا، جنھوں نے اپنے دینی فہم کو استعمال کیا۔

عباسی دور میں فقہاء کے اجتہادات

امام ابو یوسف کا زمانہ جو ہے وہ انتہائی تمدن کا زمانہ ہے اور تمدن کے مسائل اتنے پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں کہ وہ ایک امی کے بس کے نہیں ہوتے لیکن ان حضرات نے ان علمائے کرام نے، ان مجتہدین نے دین کی اس طرح تشریح کی، اس طرح استنباط کیا کہ زندگی کی ساری ضرورت اس سے پوری ہوتی تھی، اور انہوں نے ہر سوال کا جواب

متعین کر دیا، اور ایسا جواب جو شافی تھا، آپ یہ سمجھئے کہ امام ابو یوسف حنفی تھے اور انہوں نے جو استنباطات کئے ان میں حنفی فقہ کا رنگ تھا، لیکن آج بھی وہ ممالک جہاں فقہ شافعی ہے یا دوسری فقہ ہے وہاں بھی تمدنی مسائل میں استفادہ حنفی مسائل سے کیا جاتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ حنفیہ کے ائمہ نے جو اجتہاد کیا وہ تمدن کے زمانہ کا اجتہاد تھا، تمدن کے جو تقاضے تھے، تمدن کی جو ذمہ داریاں تھیں وہ انہوں نے پورا کیا تھا، تو آج دوسرے مسلک والوں کو ان مسائل میں اس سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، امام ابو یوسف، امام محمد وغیرہ کی محنتوں سے فائدہ اٹھانا پڑتا ہے، تو اللہ تعالی نے وہ دین عطا فرمایا، وہ شریعت عطا فرمائی جو اس وقت سے لے کر قیامت تک انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، اور انسانوں کے اس تنوع کا لحاظ بھی اس میں رکھا گیا ہے جو زندگی کا تنوع ہے، کہیں پر برفیلے میدانوں میں انسان رہتا ہے، کہیں ریگستانوں میں انسان رہتا ہے، کہیں تمدن کی حالت میں ہے تو کہیں جہالت کی حالت میں ہے اور بدوی زندگی گزار رہا ہے، ہر جگہ شریعت اسلامی منطبق ہوتی ہے، اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، ایسی شریعت اللہ تعالی نے ہمیں عطا فرمائی، جو استنباطات ہوئے ہیں فقہ کے یہ عہد عباسی میں مکمل ہو چکے تھے، اور اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی، سب سے بڑی تبدیلی وہی تھی کہ مسلمان اپنے جزیرۃ العرب کے صحرائی علاقہ سے نکل کر اور پھر متمدن زندگی میں آ گئے تھے، اور یورپ جہالت میں مبتلا تھا، ایران بھی پیچھے پڑ گیا اور یونان بھی پیچھے چلا گیا، اور عربوں کے پاس جو تمدن تھا اور جو ان کے قوانین تھے، جو ان کی زندگی تھی وہ پوری دنیا سے اعلی معیاری زندگی تھی، اور متنوع تھی، اور شریعت نے ان ساری ضرورتوں کو پورا کیا، وہ شریعت جو ان حضرت نے طے کر دی تھی۔ اپنے مختلف مسلکوں کے اعتبار سے آپ دیکھئے کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں چاروں مسالک مقرر ہو گئے تھے، چاروں جو مذاہب اربعہ ہیں، یہ سب دوسری تیسری صدی کے اندر کے ہیں اور شریعت اپنے اس تنوع کے ساتھ دوسری صدی میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے قابل عمل ثابت ہوئی تھی، بعد میں کچھ جزئیات آتی رہیں لیکن انسانی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔

تمدنی انقلاب اور اجتہاد

اس وقت کے بعد آج عصر جدید میں جب یورپ کا تمدن سامنے آیا اور یورپ نے ترقی کی اور سائنس نے غیر معمولی ترقی کا مظاہرہ کیا تو اب کچھ مسئلے کھڑے ہوئے، اس لئے کہ زندگی ایک نئے ڈھنگ پر آئی، جس سے اب کچھ مسائل کھڑے ہو گئے لیکن اس سے قبل ہمارے اسلاف کو کسی بڑی سوچ کی ضرورت نہیں پڑی، بس دوسری، تیسری صدی کے اندر جو کچھ غیر معمولی محنت کرنی پڑی وہ تو محنت کی، اس کے بعد فرعی اور معمولی چیزیں تھیں جس کو علماء دیکھتے رہے اور جو سوال اٹھتے تھے جواب دیتے رہے، کوئی غیر معمولی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی، لیکن یہ جو موجودہ تمدن ہے اور موجودہ ترقی ہے سائنس کی ترقی، اس نے مسائل کھڑے کئے۔

گلاسگو میں شفق کا مسئلہ

مثلاً ایک یہ مسئلہ ہے، آج سے پچیس سال پہلے مجھے ایک مرتبہ یورپ جانے کا اتفاق ہوا، انگلستان، وہ گرمیوں کا زمانہ تھا، جس میں رات بہت چھوٹی ہوتی ہے تو وہاں گلاسگو جا کر معلوم ہوا کہ یہاں ایک بڑا مسئلہ چل رہا ہے، وہ یہ کہ شفق ڈوبتی نہیں ختم نہیں ہوتی حتی کہ فجر ہو جاتی ہے، یعنی شفق ہی فجر ہو جاتی ہے، لیکن کب ہوتی ہے، لہذا کب سے اس کو فجر سمجھا جائے اور کب تک اسے شفق سمجھا جائے، اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہو گیا، وہاں کئی گروہ بن گئے، اہل فقہ کے گروہ، معلوم ہوا کہ فجر کی نماز یہاں جہاں ہم لوگ ٹھہرے تھے ایک جماعت آ کر بارہ ساڑھے بارہ بجے رات میں فجر کی نماز پڑھتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نصف نصف تقسیم کر لیتے ہیں، نصف اول رات شفق میں اور نصف ثانی کو فجر میں شمار کرتے ہیں، اور دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ نہیں، جو معتدل علاقہ ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ڈیڑھ گھنٹے کا وقت فجر کو دیتے ہیں اور ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہم کو شفق دیتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد عشاء ختم ہو جاتی ہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دونوں کو دیا جائے گا، فجر ہو یا شفق ہو، سوا گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ، شوافع کے یہاں غالباً سوا گھنٹہ اور احناف کے یہاں ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم ڈیڑھ گھنٹہ شفق کے لئے رکھتے ہیں اور ڈیڑھ گھنٹہ فجر کے لئے رکھتے ہیں، اور یہی ڈیڑھ گھنٹہ یا سوا گھنٹہ کی مدت دونوں کے لئے شروع سے چلتی رہی ہے اور کوئی انقلابی صورت حال پیش نہیں آئی۔

نصوص پر گہری نظر

لیکن موجودہ تمدن میں انقلابی صورت حال پیدا ہو گئی، اس وقت ہم کو اس طرح نئی باتوں میں اجتہاد کرنے کی ضرورت پڑے گی اور اسی ہمت، اسی صلاحیت کا ثبوت دینا پڑے گا عہد اول نے جس صلاحیت کا ثبوت دیا، یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر گہری علمی سوچ کے ہم اس میں رائے قائم کر لیں نہیں، بلکہ اسی واقفیت، اسی ذہانت، نصوص پر وہی گہری نظر رکھتے ہوئے ہمیں کام کرنا ہوگا، جب جا کر ہم ان مسائل کا جواب دے سکیں گے جو مسائل اس وقت اٹھ رہے ہیں، اور اگر ہم ان کا جواب نہیں دیں گے تو ہماری شریعت پر شبہ کیا جانے لگے گا، شریعت کو ناقص سمجھا جانے لگے گا، جو شریعت امی عربوں کو دی گئی تھی، اگر وہ اجتہاد نہ کرتے محنت نہ کرتے تو دنیا کہتی کہ اسلام امیوں کا مذہب ہے، دوسرے لوگ اس پر عمل کر ہی نہیں سکتے، اس لئے کہ ان میں جو تمدن آ گیا تھا اور عربوں کا بن گیا تھا، جو دنیا میں سب سے زیادہ فائق تھا، اس تمدن کے جو تقاضے تھے اگر اس کا جواب ہماری شریعت نہیں دے سکی ہوتی تو صاف سمجھا جاتا کہ یہ شریعت جزیرۃ العرب کے لئے اور ان پڑھ لوگوں کے لئے ہے، دنیا کے دوسرے حصوں کے لئے نہیں ہے لیکن ہمارے اسلاف نے یہ پوزیشن نہیں بننے دی، اپنے کو اس میں کھپایا اور ایسے جوابات اس کے مرتب کئے اور ایسے استنباطات کئے کہ جس

پر سب مطمئن ہوئے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا، آج ہم کو اسی طرح کی محنت کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کے اصول و شرائط کا لحاظ

چونکہ اب ایسے افراد نہیں ہوتے جو کہ اتنا استیعاب رکھتے ہوں، جو اتنے حاوی ہوں ان ساری چیزوں پر، ان سارے گوشوں پر کہ جن کی ضرورت پڑتی ہے اجتہاد اور استنباط کے لئے، اس لئے بہتر طریقہ یہی ہے جو ماشاء اللہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ اکیڈمیاں ہوں، مجالس ہوں، جن میں ضروری صلاحیتوں کے علماء جمع ہوں، وہ علماء جو شریعت کے متنوع گوشوں کی ممتاز صلاحیت رکھتے ہوں، عام صلاحیت والوں کو میں نہیں کہہ رہا ہوں، ان علماء کو کہہ رہا ہوں جو اجتہاد کی اور استنباط کی اچھی صلاحیتیں رکھتے ہوں، ان میں تنوع ہو سکتا ہے، اور ان کے علم کے مدارج ہو سکتے ہیں، لیکن اگر پوری جماعت بیٹھے گی تو ایک دوسرے کے مطالعہ سے، ایک دوسرے کی واقفیت سے فائدہ اٹھائے گی، اور جو مذاکرہ ہوگا اس مذاکرہ سے صحیح حل نکل سکے گا جو بہتر سے بہتر حل ہوگا اور ظاہر ہے کہ اسی دائرہ میں نکالنا ہوگا جو نصوص کا دائرہ ہے اور پھر نصوص کے بعد اجتہاد کا دائرہ ہے، ہمارے اسلاف نے جو اجتہاد کیا ہے اور جو انہوں نے طریقہ اختیار کیا ہے، جو اصول مقرر کئے ہیں اجتہاد کے لئے اور استنباط کے لئے ان اصولوں کی بنیاد پر کرنا ہوگا، ہم اپنی طرف سے کوئی چیز ایجاد نہیں کریں گے، ہمیں اسی لائن پر چلنا ہوگا، اسی دائرہ کے اندر رہ کر کرنا ہوگا۔

دین کی خاص سمجھ ''وعی'' کا استعمال

لیکن اس میں ہم اپنی پوری ذہانت استعمال کریں گے، وہ ذہانت جسے دینی ذہانت کہنا چاہیے، اور وہ اللہ تعالی ان کو عطا فرماتا ہے جو اللہ تعالی کے کلام اور اس کے نبی کے کلام کے ساتھ تعلق و اشتغال رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ وہ پیدا کر دیتا ہے، وہ ایک سمجھ ہوتی ہے، اس کو ہم سمجھ ہی کے لفظ سے ادا کر سکتے ہیں، ایک وعی ہوتی ہے جو نظر کو صحیح جگہ پہنچا دیتی ہے، جیسے آدمی کا ایک ادراک ہوتا ہے کہ جو رہنمائی کر دیتا ہے کہ فلاں بات تو نہیں ہو سکتی، دین کا جو مزاج ہے اس کے لحاظ سے یہ چیز مطابقت نہیں رکھتی، فقیہ شخص یہ کس بنیاد پر کہتا ہے، یہ اس سمجھ کی وجہ سے کہتا ہے جو اللہ تعالی عطا فرماتا ہے، جس طرح دنیا کی ایک سمجھ ہوتی ہے اسی طرح دین کی بھی ایک سمجھ ہوتی ہے کہ فوراً آدمی بھانپ لیتا ہے کہ یہ بات دین کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔ یہ شریعت اسلامی کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی ہے، تو اس سے آدمی کی حفاظت ہو جاتی ہے گویا کہ ایک احاطہ میں آ گیا جس کی وجہ سے وہ خطرے سے بچ جاتا ہے، غلط کام نہیں کر سکتا۔

شریعت کے مقاصد سے واقفیت

یہ کام اکیڈمیوں کے ذریعہ سے، ایسی مجالس کے ذریعہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے ہوتا ہے تاکہ اگر ایک آدمی سے کوئی بھول ہو رہی ہوگی تو دوسرا آدمی اس کو متنبہ کر دے گا کہ آپ کو اس کے سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے، اس نص کا

تقاضا یہ ہے، اور ہمارے بڑوں نے جو استنباط کیا تھا اس کا تقاضا یہ ہے، اس کی یہ روح ہے اور اس ضرورت کے لئے شریعت کے مقاصد کو جاننا ضروری ہے، اگر ہم مقاصد کو نہیں جانتے اور ان وجوہ واسباب کو نہیں جانتے اور سمجھتے جو شریعت کے اندر رکھے گئے ہیں تو پھر ہم کوئی بڑا کام نہیں کر سکیں گے اور کسی اچھے فیصلے تک ہم نہیں پہنچ سکیں گے، مقاصد تو بہر حال سامنے رہنے چاہئیں اور اس پر بڑا کام بھی ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اور یہ سیمینار اسی پر ہے، اللہ تعالی نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور اللہ تعالی تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا، اس سے صاف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی کمزوریوں کا، انسان کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جو شریعت دی ہے اس میں اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ انسان جہاں پر کمزور پڑتا ہے، جہاں پر اس کی ضرورت کا تقاضہ خاص ہوتا ہے وہاں اللہ تعالی نے گنجائش دی ہے، اور وہ گنجائش اس بعض نصوص کے سمجھنے کے اختلاف میں ہے، جن چیزوں کے سمجھنے میں اختلاف کی گنجائش ہے تو وہ حقیقت میں اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس میں ہمارے لئے ایک گنجائش دی گئی ہے، کہ ہم اپنے کو دیکھیں، اپنی صلاحیتوں کو ٹٹولیں اور اس کے مطابق کام کریں، اور ہمارے جو فقہ کے ائمہ ہیں انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس کی وجہ سے انہوں نے بالکل ایسی واضح تفصیل شریعت کی دے دی ہے کہ ہم گزشتہ صدیوں میں برابر آسانی کے ساتھ عمل کرتے چلے آئے، ہمیں کوئی پریشانی و دشواری نہیں ہوئی، البتہ ہم کو اب غیر معمولی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑے گی لیکن احتیاط کے ساتھ اور اس سرمایہ کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہمارے پاس نصوص کا اور اجتہادات کا ہے، دونوں کو سامنے رکھنا پڑے گا، نصوص جو ہیں پھر اجتہادات، دونوں کو دیکھ کر کرنا ہوگا، پھر خود اللہ تعالیٰ ہم کو وہ سمجھ عطا فرمادے گا کہ ہم جو فیصلہ کریں گے وہ صحیح فیصلہ ہوگا یہ سمجھ اللہ تعالی کی طرف سے مدد ہوگی۔

معاصر اجتہاد

عمل، تقاضے اور مشکلات

مولانا ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
(پروفیسر شعبہ اسلامیات، مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسیٹی، حیدرآباد)

۱۔ اجتہاد کا تصور

'اجتہاد' ملت اسلامیہ کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے، یہ جتنا ضروری ہے، اتنا ہی اہم بھی ہے۔ اور مزاج شریعت سے آشنا کوئی بھی شخص شاید ہی اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار کی جرأت کر سکے۔ صحابی رسول حضرت معاذ بن جبلؓ کے ساتھ نبوی مکالمہ کی گونج ہمیشہ کانوں میں گونجتی رہے گی، جس میں زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار ہوتا ہے کہ زندگی کے نت نئے مسائل میں جب قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں واضح حکم نہ ملے تو شرعی رہنمائی کی دریافت کا تیسرا اختیار کیا ہوگا؟ اور فقہی امتیاز سے ممتاز صحابی رسولؓ برملا فرماتے ہیں کہ: "اجتهد رايي و لا آلو" (۱)۔ (تب میں اپنی عقل وفہم کا استعمال کرتے ہوئے اجتہاد کروں گا اور اس میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کروں گا)۔

یہ مکالمہ جہاں اپنے اندر کئی صراحتیں رکھتا ہے، وہیں اس بات کی جانب اشارہ بھی کہ روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر ایسے مسائل کا سامنا ہوگا، جن میں اجتہاد کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ اور فقہاء ومجتہدین نے اسی اشارہ کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے زندگی کی اہم حقیقت کو نمایاں کیا کہ: "النصوص متناهية و الحوادث غير متناهية"۔ (یعنی احکام وہدایات تو محدود ہیں اور پیش آنے والے واقعات لامحدود ہیں)۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ Text اور کتاب کے صفحات تو ہمیشہ محدود ہی رہیں گے، لیکن زندگی کے مسائل اس وقت تک نو بہ نو پیدا ہوتے رہیں گے جب تک روئے ارضی پر حیات انسانی باقی ہے۔

۲۔ اجتہاد کا عملی منظر نامہ

عملی تناظر کی طرف آیئے تو اسلام کی آمد کے جشن بہار سے لے کر آج کے پر پیچ لمحات حیات تک کون سا ایسا دور ہے جو اجتہاد کی عملی کاوشوں سے خالی رہا ہو، شاید کوئی نہیں۔ اگر ہم ڈیڑھ ہزار برس کے اس پورے تاریخی دورانیے کو چند موٹے اور

بڑے حصوں میں تقسیم کرنا چاہیں تو صاف طور پر یہ تین ادوار میں منقسم ہو سکتے ہیں۔

تحرک کا دور

ایک وہ زریں دور جو اسلام کے تحرک اور اس کے امتداد کا زمانہ ہے، جس میں اجتہاد کا غلغلہ ہے۔ مسائل پیدا بھی ہو رہے ہیں۔ اور اجتہادی محفلوں میں حل بھی ہو رہے ہیں۔ دونوں کی برق رفتاری تقریبا یکساں ہے، بلکہ شاید حل کی رفتار مسائل کی پیداوار سے کچھ زیادہ ہی تیز تر ہے، جبھی تو موجودہ مسئلوں سے نمٹ لینے کے بعد مفروضہ مسائل پر طبع آزمائی ہو رہی ہے۔ نئے مسئلے نہیں مل رہے ہیں تو ذہنی کاوشوں سے مسئلوں کی تصوراتی دنیا میں جولانی کی جارہی ہے۔ اور اس طرح 'فقہ تقدیری' کا پورا سرمایہ وجود میں آرہا ہے۔ یہ آئیڈیل زمانہ اپنے مختلف اور متنوع نمونوں کے ساتھ تین اور چار صدیوں تک دراز رہا ہے۔

نرم رفتار اجتہاد

دوسرا دور اس کے بعد سے اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتداء تک ایک ایسا زمانہ ہے جسے نرم رفتار اجتہاد یا خال خال اجتہاد کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور گو بڑا طویل ہے، اور اجتہادی ہمہ ہمی کی سابقہ مثالیں اس میں ناپید ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ اجتہاد سے یکسر خالی ہے۔ اس دور میں اجتہاد کے وجود اور جمود کے تعلق سے نظریاتی گفتگو تو بہت ہوئی ہے اور مختلف نتائج پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن واقعاتی سطح پر مجتہدین کی وہ لمبی قطار کس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہے، جو چوتھی صدی کے بعد اسی مزعومہ 'جمود' اور 'رکود' کے دور میں ظاہر ہوئی ہے۔ امام الحرمین عبدالملک بن عبداللہ جوینی (متوفی ۴۷۸ھ)، امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ)، امام رافعی (متوفی ۵۵۷ھ)، امام برہان الدین مرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ)، امام عزالدین بن عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ)، امام ابن دقیق العید (شاگرد ابن عبدالسلام)، امام ابن سید الناس (متوفی ۷۳۴ھ)، امام تقی الدین ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ)، امام ابن القیم (متوفی ۷۵۱ھ)، امام زین الدین عراقی (متوفی ۸۰۶ھ)، امام ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ)، امام سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، امام کمال الدین ابن الھمام (متوفی ۹۶۱ھ)، اور امام شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) وغیرہ اجتہاد کی طلائی زنجیر کی چند کڑیاں ہیں، اور یہ تو چند زبان زد عام اور ممتاز نام ہیں۔ ورنہ اس دور کی فضائے بسیط بھی علمی کہکشاؤں سے جگمگا رہی ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ اب زمانہ کے تقاضے اور ہیں اور اس دور کا اجتہاد اپنے تقاضوں کا تابع ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اجتہاد تو کسی بھی دور میں وہی مطلوب ہے جو اس دور کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہو (۲)۔ کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تقریبا سات صدیوں پر محیط اس طولانی زمانہ کے کسی حصہ میں مسلمانوں کے سامنے نو پیش مسائل کے انبار کھڑے ہو گئے ہوں اور وہ زمانہ ایسے علماء سے محروم ہو جو ان مسائل کا شرعی حل بتائیں؟ اگر ایسا واقعہ

رونما نہیں ہوا ہے تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانے میں زندگی اپنی رفتار پر پوری قوت کے ساتھ بریک لگا چکی تھی۔اور نتیجۃ کوئی نئی صبح اپنے ساتھ نیا مسئلہ نہیں لاتی تھی۔

جب یہ دونوں باتیں ناپید ہیں تو کھلی حقیقت یہی تو بنتی ہے کہ مسائل جیسے اور جتنے بھی سامنے آتے تھے، وقت کے اہل علم ان کے شرعی حل پیش کرتے تھے۔اب اس عمل پر اصطلاحات کا پیراہن ڈال کر ہم جو چاہیں تقسیم کریں،اور کہیں کہ اجتہاد مطلق نہیں تھا،اجتہاد فی الشرع نہیں پایا گیا،یا اجتہاد فی المذھب پایا گیا،یا اقوال مذہب پر تخریج یا مختلف رایوں میں ترجیح کا عمل پایا گیا۔نام ہم جو بھی چاہیں دیں،اور اصطلاحات کی جو درجہ بندی مناسب حال ہو وہ کریں۔لیکن اتنی بات تو ضرور تھی کہ وہ اپنے وقت کے تقاضوں کو پورا کررہے تھے اور پیش آنے والے مسئلوں کی گرہیں کھول رہے تھے۔اور اجتہاد کی جو تعریف اہل اصول کرتے ہیں وہ اپنے وسیع مفہوم میں اس عمل پر ضرور منطبق ہوتی ہے(۳)۔کیونکہ مسئلہ کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے وہ اپنی پوری کوشش صرف کررہے تھے۔اور صحابی رسول حضرت معاذ بن جبلؓ نے مکالمہ نبوی میں اسی رویے کا اظہار کیا تھا کہ ”میں اپنی رائے سے اجتہاد یعنی پوری کوشش کروں گا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا“۔

دور جدید میں اجتہاد

موجودہ دور جو اجتہاد کی تاریخ کا تیسرا حصہ ہے،اس کی تین صدیوں کے احوال کافی کچھ دیدہ اور بہت کچھ اپنی تفصیلات کے ساتھ شنیدہ ہیں، یہ نئے مسئلوں اور الجھے سوالوں کی ایک ایسی موج ہے جو آگے بڑھتی جارہی ہے،اوپر چڑھتی جارہی ہے اور پھیلتی بھی جارہی ہے۔ایک موج سے کئی موجیں نکلی پڑرہی ہیں اور مسائل کے دریا کا دامن اپنی کشادگی بڑھاتا جارہا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب نے جو مسائل پیدا کئے ان پر علماء عظام نے بڑھ کر داد تحقیق دی،کرنسی نوٹ،بنک کا چیک اور انٹرسٹ،جدید اوزان،زمینوں کی صورت اور کارخانوں کی مصنوعات پر گفتگو جاری تھی کہ انیسویں صدی نے معاش و معاشرت اور علاج و آمدورفت کے میدانوں میں تیزی سے ترقی کے اتنے زینے طے کئے کہ نئے نئے معاملات،نئے نئے سوالات اور نئی نئی مشکلات بڑی تعداد میں سامنے آگئیں۔ماہرین شریعت نے ان پر غور و خوض کئے،اور ان کے حل پیش کرتے گئے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ بیسویں صدی نے نئے مسائل کے دہانے کھول دئے۔یہ مسائل صرف ترقیات کا نتیجہ نہیں تھے،بلکہ ان پر تیزی سے درآنے والی تبدیلیوں کا انعکاس بھی پڑرہا تھا۔اور یہ تبدیلیاں مثبت اور منفی دونوں رنگ و آہنگ لئے تھیں۔اس دور کے مسائل زندگی کے چند میدانوں تک محدود نہیں تھے،بلکہ ہر جگہ ظاہر ہورہے تھے۔اور بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے تو مسائل ان گنت ہوگئے۔اب ترقیات اور تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ فساد و بگاڑ

بھی عام ہوگیا، اور سماجی واخلاقی انارکی پھیل گئی، جس نے ہمدردانہ مشکلات کو بھی پے چیدہ بنادیا۔ اور حد سے بڑھی مادیت اور نفع پرستی کے رجحان نے مسائل کے منفی پہلو کو اس کے مثبت اور مفید پہلو پر غالب کردیا۔ اور ان سب کے ساتھ حلال وحرام کی حدوں یا آسمانی اخلاقیات کی قیدوں سے آزاد تحقیقات وتجربات نے طبی اور سائنسی میدانوں میں ایسے نتائج برپا کیے جس نے کئی مفروضات کو حقائق میں بدل دیا اور شرعی واخلاقی سوالات پیدا کیے۔

یہ آخری دور پچھلے دونوں زمانوں سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس دور میں اجتہاد کے تقاضے بھی بدلے اور اجتہاد کی راہ میں مشکلات بھی آئیں۔ یہ دور ابھی جاری ہے، مسائل ومشکلات کی جدت اور الجھاوے بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ اور اجتہاد کے تقاضے اور راہ اجتہاد کی مشکلات بھی ہنوز باقی ہیں۔

۳۔ معاصر اجتہاد پر نظر

معاصر اجتہاد پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا منظرنامہ کچھ مخصوص طور پر سامنے آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسائل کی تیز رفتاری کے ساتھ اجتہاد کی بزم آرائی بھی تیز ہوئی ہے۔ انفرادی کوششیں اپنی جگہ پر بدستور جاری ہیں، لیکن اجتماعی اجتہاد کے بہت ہی باوقار اور مستند ادارے پے بہ پے قائم ہوئے ہیں، یہ ملک کے اندر بھی ہیں اور بیرون ملک بھی۔ سرزمین اسلام سعودی عرب میں بھی ہیں اور ایشیا و یورپ اور امریکہ کے دور دراز ممالک میں بھی۔ ان میں سے کئی اداروں کی خدمات اور اجتہادی سرگرمیاں بہت ہی قابل قدر ہیں۔ اور انھوں نے معاصر اجتہاد کی روشن مثال قائم کی ہے (۴)۔ لیکن یہاں پر چند نکات ایسے ضرور سامنے آتے ہیں جن پر غور وخوض کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

منہجی اختلاف

اول یہ کہ اجتہاد کا عمل کچھ اصول اور ضوابط کا تابع رہتا ہے، ان اصول اور ضوابط کی تعیین اہل علم نے کی ہے، ان میں کچھ متفقہ ہیں اور کچھ علاحدہ علاحدہ۔ اور ان ہی اصولوں کی بنا پر تاریخ کے مختلف حصوں میں مختلف فقہی مسالک وجود میں آئے ہیں (۵)۔ سب کا مقصد ایک ہی رہا کہ درپیش مسئلہ کا وہ حکم معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے مطابق ہو۔ مقصد ایک تھا، لیکن نہج مختلف تھے، اس لئے بیشتر اوقات نتائج بھی مختلف آئے۔ یہ صورت مسئلہ آج بھی برقرار ہے۔

اس سے دو موقعوں پر دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک ان نشستوں میں جہاں مسائل کی کثرت جدت اور پے چیدگی نے مختلف نہج سے جڑے اہل علم کو اجتہاد کی ایک محفل میں جمع کردیا ہے۔ وہاں اجتہادی عمل کے دوران ان کے ذریعے اپنے اصولی اور منہجی فرق کی پابندی کسی یکساں نتیجہ تک پہنچنے میں باعث دشواری بنتی ہے۔

دوسرے اس موقع پر جب ایک گاؤں کہی جانے والی آج کی سمٹی ہوئی دنیا میں ایک منہج فکر کی نشست کا فیصلہ اور نتیجہ دوسرے منہج فکر کے نتیجہ سے ایک ہی مسئلہ میں جدا جدا ہو کر سامنے آتا ہے۔ ایسے موقع پر عالمی گاؤں کی آبادی میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور منہجی اختلاف کی تفصیلات سے ناآشنا اکثریت کے ذہنوں میں مختلف قسم کے رد عمل کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔

یہ نکتہ اہل علم ونظر کے غور کرنے کا ہے۔ اس سلسلہ کے غور وفکر میں متفقہ اصولوں پر نظر اور مقصد پر اصرار کسی مثبت اتفاق تک پہنچانے میں معاون بن سکتا ہے۔

فکر ونظر کی حدیں

اجتہاد کے معاصر عمل میں ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ سماج کی دشواریوں اور انفرادی یا اجتماعی الجھنوں کے موضوعات پر غور کرتے وقت بسا اوقات فکر ونظر کی حدیں ان اجتہادات اور فقہی عبارات تک محدود ہونے لگتی ہیں جو شریعت کے بنیادی مصادر یعنی قرآن وحدیث سے استدلال کا وقیع نتیجہ ہیں۔ اس رویے کے تحت انجام پانے والے غور و فکر کے نتائج کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ وہ فقہی اقتباسات اور وقیع اجتہادات کے چوکھٹے میں فٹ تو رہتے ہیں، لیکن سماج کی وہ دشواری کافی حد تک برقرار رہ جاتی ہے جس کو حل کرنے کے لئے بزم اجتہاد سجائی گئی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اجتہاد کا مرحلہ تب ہی آتا ہے، جب درپیش دشواری کا جواب نصوص کے اندر موجود نہ ہو۔ پھر نصوص کی روشنی میں غور کرتے ہوئے دشواری کا حل نکالا جائے۔ لہٰذا اجتہاد موجود حکم کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ غیر موجود حکم کی تلاش وجستجو ہے۔ اور اسی عمل کی وجہ سے شریعت کے ان احکام کا عظیم ذخیرہ وجود میں آیا ہے جو منصوص نہیں، مستنبط ہیں، اور فتاویٰ یا اجتہادات کہلاتے ہیں۔ اس قابل فخر ذخیرہ میں ہمیں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ سماج کی دشواری غور وفکر کے ایک نتیجہ سے حل نہیں ہوئی، یا اس حل سے نتیجہ برعکس مرتب ہونے لگا تو غور وفکر کو تبدیل کر دیا گیا، اور ایسا حکم دیا گیا جس سے دشواری حل ہو جائے۔ کیونکہ شریعت زندگی کے لئے ہے اور اجتہاد زندگی کے مسائل اور دشواریوں کو رضائے الٰہی کے مطابق اور شریعت کی رحمتوں کے سایہ میں حل کرنے کے لئے ہے۔

شکل اور مقصد

تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شریعت کے احکام و اوامر ظاہری شکل کے ساتھ ساتھ اپنے اندر مقاصد اور اہداف بھی رکھتے ہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ کچھ ابواب ایسے ہیں جہاں صرف مقصد مطلوب نہیں بلکہ شکل پر بھی شریعت کو اصرار ہے۔ عبادات، حدود اور محرمات و مواریث وغیرہ کے ابواب میں بیشتر جگہوں پر ظاہری شکلیات اور لفظی پابندیوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن معاشی روابط وعقود، سماجی تعلقات و امور اور عرفی ورواجی اشیاء میں

مقصد کو بڑی حد تک شکل پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ یہ نکتہ اجتہاد کی تاریخ میں ہمیشہ ملحوظ رہا ہے۔ اور بنیادی مصادر شریعت کے ساتھ ثانوی مصادر شریعت کا اضافہ اور ان میں ائمہ عظام کے درمیان اختلاف دراصل اسی نکتہ کی رعایت اور تکمیل کے باعث ہوتا رہا ہے۔ اہل علم آگاہ ہیں کہ استحسان کو تسلیم کرنے والے اور اس کا انکار کرنے والے دونوں گروہ مجتہدین کا مقصود نظر ایک ہی ہے (۶)۔ اسی مقصود کے لئے کہیں استصلاح اور مصالح مرسلہ کا استعمال ہوا ہے، تو کہیں قیاس کی گرم بازاری پائی گئی ہے۔ موجودہ تبدیلیوں کے دور میں معاشی وسماجی اور عرفی امور کے مسائل میں اس نکتہ کی رعایت سے ہی اجتہاد کے نتائج مسئلہ کا حل بن کر سامنے آسکیں گے۔

۴۔ دو قابل غور پہلو

یہ تین نکات جو اوپر پیش کئے گئے، معاصر اجتہاد میں ان کی حیثیت دشواریوں اور مشکلات کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ چیلنجز ہیں جن سے روبرو ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں پر دو مزید پہلوؤں کی نشاندہی ضروری محسوس ہوتی ہے، اور وہ بھی معاصر اجتہاد کے لئے کسی چیلنج سے کم نہیں ہیں۔

اختصاصی عمل

سابقہ سطور میں اس احساس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اجتہاد عمل کی دنیا میں جاری وساری رہا ہے، یہ اسلامی تاریخ کے اس درمیانی طویل دورانیے میں بھی پوری طرح پایا جاتا رہا ہے، جو بہت سے اہل دانش کی زبان وقلم پر جمود کا دور کہا جاتا ہے۔ اجتہاد دراصل زندگی کے لئے ہے، اور زندگی جب رواں دواں ہے تو اجتہاد بھی اس کے دوش بدوش چلتا اور بڑھتا رہے گا۔ لیکن آج کئی موقعوں پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ علماء نے اجتہاد کے لئے ایسی شرائط لگائی ہیں جن کی موجودگی بے حد دشوار ہے۔ اور اس کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ اجتہاد کے تقدس، اس کی رفعت اور نزاکت بھری اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے یہ حقیقت تو ماننی ہی پڑتی ہے کہ ہر بعد کے زمانے میں علمی قابلیت کی وہ عمومی رونق گھٹ جاتی ہے جو سابق میں موجود تھی۔ اور اسی لئے ہم نے سطور بالا میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہر دور میں اجتہاد اپنے اسی معیار کے مطابق پایا گیا ہے، جو اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ اور اجتہاد کی جن شرائط کا تفصیل سے تذکرہ فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں میں ملتا ہے، وہ اس وقت کے مطلوبہ درجہ میں ہی سہی عمل اجتہاد سے جڑے لوگوں میں پایا گیا ہے۔ لیکن ہم یہاں یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ اجتہاد لازماً ایک اختصاصی عمل ہے۔ ایک قانونی مرحلہ ہے، یہ ایک ایسی ذہنی کاوش ہے جس کا ایک سرا الٰہی تقدس سے مربوط ہے اور دوسرا سرا زندگی کی حقیقتوں سے جڑتا ہے۔ اور یہ دوطرفہ تعلق اس ذہنی کاوش کو محض مشینی عمل کی سطح سے اوپر بہت اوپر اٹھا کر قلب وعمل کی پاکیزگی اور فکر ومقصد کی تقدس آمیز بلندی تک لے جاتا ہے۔ پس اجتہاد میں اس ماحول کی فراہمی ضروری ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ علوم وفنون کے کتنے ہی رازہائے سربستہ اب واشگاف ہوگئے ہیں، علمی خزینوں کے دفینے اب انگلیوں کی دسترس میں آگئے ہیں، اور متعلقہ معلومات کی تلاش، تجزیہ اور تحقیق کا عمل بہت کچھ سہل ہوگیا ہے۔لیکن کیا یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ ایک ایسا فرد جو قرآن وحدیث کی زبان اور اس کے معانی کی نزاکتوں سے ناواقف ہو، جو شریعت کے قانونی مزاج سے ناآشنا ہو اور جو خدا ترسی کے اوصاف سے عاری ہو، محض تکنیکی معلومات کا سہارا لے کر اجتہاد کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے؟ راقم کا جواب قطعا نفی میں ہے۔

نص جزئی پر نظر

دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ جب ہم اجتہاد کے عمل میں لفظیت اور مقصدیت کی بات کرتے ہوئے مقصد کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعہ احکام اس طرح طے کئے جائیں کہ مقاصد شرع کی رعایت ہو اور مسائل کا حل سامنے آئے۔تو اس موقع پر کئی حلقوں میں یہ نکتہ قابل تشویش بنتا ہے کہ مقاصد کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں کہیں شذوذ آراء کے فروغ اور واضح نصوص جزئیہ کی خلاف ورزی کی نوبت تو نہیں آرہی ہے؟ دراصل یہ بہت نزاکت بھرا مرحلہ ہے، مقاصد شرع کی بے حد اہمیت ہے، اور اجتہاد میں اس سے صرف نظر حکم کو روح سے خالی بنا سکتا ہے۔اور وہ مقصد ہی فوت ہوجا سکتا ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، اور جس کی جانب توجہ قرآن کی آیات میں بار بار دلائی گئی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی شرع سازی میں متعدد مواقع پر جس کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔لیکن دوسری جانب احادیث نبویہ کا ذخیرہ اور واضح نصوص کی رہنمائی اسلامی شریعت کا وہ سرمایہ ہے جس سے وابستگی کو ہی رسول اکرم ﷺ نے صلاح وفلاح کی ضمانت قرار دیا ہے(۷)۔حتی کہ آپ ﷺ نے ان مواقع سے بھی آگاہ فرمایا ہے جب یہ کہا جانے لگے گا کہ حدیث کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، صرف قرآن ہمارے لئے کافی ہے(۸)۔کیونکہ الفاظ قرآنی کے مفاہیم کی تشریح اور تعیین حدیث نبوی ﷺ سے ہی ہوتی ہے۔اور حدیث کا بیشتر حصہ جزئی نصوص اور اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔تیسری جانب یہ بات بھی اہم ہے کہ بعض نصوص خود ہی عرف یا وقتی اسباب پر مبنی ہوتی ہیں اور عرف کی تبدیلی کی صورت میں وہ حکم گو کہ نص میں موجود ہے، اپنے مقصد کے پیش نظر نئے عرف کے مطابق تبدیل ہوجاتا ہے(۹)۔پس نص جزئی کی رعایت، نص کی نوعیت پر نظر اور مقصد شرع کا لحاظ یہ تین جانبی وہ دائرہ ہے جس میں رہ کر معاصر اجتہاد کو اپنا عمل انجام دینا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔سنن ابی داؤد شریف، کتاب الاقضیہ۔

۲۔شاطبی نے لکھا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں: اول وہ قسم جو اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی جب تک دنیا باقی ہے۔

یہ وہ اجتہاد ہے جو تحقیق مناط سے تعلق رکھتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حکم تو اپنے دلیل کی وجہ سے ثابت ہے،لیکن واقعہ پر اس کی تطبیق کے لئے غور وخوض جاری رہے گا۔ (الموافقات فی اصول الشریعہ ۴/ ۵۳،المکتبۃ العصریۃ،بیروت)

۳۔ ماضی قریب کے مشہور فقیہ علامہ ابوزھرۃ نے لکھا ہے کہ مجتہد کے تین درجات ہیں: مجتہد فی الشرع ،مجتہد منتسب،اور مجتہد مذہب۔اس کے بعد تخریج اور ترجیح کا درجہ ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر درجہ کے اندر ایک نوعیت کا اجتہاد انجام پاتا ہے۔(اصول الفقہ ،صفحہ ۳۹۵،دار الفکر العربی ۱۹۵۸ء)

۴۔ دور حاضر میں قائم ہونے والے اجتماعی اجتہاد کے مشہور اداروں میں سے چند کے نام یہ ہیں: مجمع البحوث الاسلامیہ مصر (قیام ۱۹۶۱ء)،المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ (قیام ۱۹۷۸ء)،مجمع الفقہ الدولی جدہ (قیام ۱۹۸۱ء)، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا (قیام ۱۹۸۹ء) مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوہ لکھنؤ (قیام ۱۹۶۳ء)، ادارہ مباحث فقہیہ دہلی (قیام ۱۹۷۰ء) اور المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث،آئرلینڈ (قیام ۱۹۹۷ء)۔

۵۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ،صفحہ ۱۴۵ ،فیصل پبلیکشنز، دیوبند

۶۔ استحسان کے تعلق سے فقہاء کے اختلاف کو کئی محققین نے محض لفظی قرار دیا ہے۔مشہور اصولی عالم ابن حاجب (متوفی ۶۴۶ھ) نے لکھا ہے:ایسا استحسان پایا ہی نہیں جاتا جس میں اختلاف ہو۔(حاشیہ الفصول فی الاصول للرازی،تحقیق:عجیل نشمی (وزارت اوقاف کویت ۱۹۹۴ء)

۷۔ حدیث شریف میں ہے : میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں،تم جب تک انہیں پکڑے رہوگے گمراہ نہیں ہوگے۔اللہ کی کتاب اوراس کے رسول ﷺ کی سنت۔ (مشکاۃ المصابیح،بیروت ۱۹۸۵ء۔)

۸۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے پاس میری حدیث پہنچے، اور وہ تکیہ سے ٹیک لگائے یہ جواب دے کہ ہمارے تمہارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔کتاب اللہ کا حلال ہمارے لئے حلال ہے اوراس کا حرام حرام ہے۔تو سن لو کہ جو رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا ہے وہ بھی کتاب اللہ کی طرح حرام ہے۔(ترمذی شریف،باب العلم،حدیث نمبر ۲۵۸۸)

۹۔ علامہ قرافی نے لکھا ہے: شریعت کے وہ تمام مسائل جو رواج وعادت کے تابع ہیں،ان میں رواج کے بدل جانے کے وقت احکام بھی بدل کر نئے رواج کے مطابق ہوجائیں گے۔(الاحکام فی تمیز الفتاوی من الاحکام ص:۶۷)

فقہاء کے اختلاف میں علم حدیث کے اثرات

مولانا عتیق احمد بستوی
(استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اللہ تعالی نے اپنے سب سے اعلی واشرف رسول خاتم النبیین حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنا آخری اور مکمل صحیفۂ ہدایت قرآن کی شکل میں نازل فرمایا اور تا قیامت قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا: ''إنا نحن نزلنا الذکر وإنا لہ لحافظون'' (سورہ حجر:۹)۔

قرآن کی حفاظت سے مراد محض الفاظ قرآن کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ، الفاظ قرآن سے آگے بڑھ کر اس کے معانی ومطالب اور اس کے احکام تک وسیع ہے اسی طرح نبی اکرم (فداہ ابی وامی) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال وتقریرات کا وہ حصہ جس کے بغیر قرآن کے معانی واحکام اور قرآن کی گہرائیوں تک رسائی ممکن نہیں اس کی حفاظت بھی حفاظت قرآن کے دائرہ میں داخل ہے، حفاظت قرآن کا وعدہ درحقیقت پورے اسلام کی حفاظت کا وعدہ ہے، کیوں کہ قرآن ہی کے سرچشمہ سے اسلامی عقائد واحکام، اسلامی اخلاق ومعاملات کی نہریں جاری ہوئیں، سنت رسول قرآن کی جامع تفسیر ہے اور علوم اسلامیہ اس کی شیریں پھل، اسی حقیقت کو زبان رسالت نے ان الفاظ میں بیان کیا:

یرث ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تاویل الجاھلین وانتحال المبطلین وتحریف الغالین۔ (السنن الکبری للبیہقی، کتاب الشہادات، باب الرجل من اہل الفقہ یسال عن الرجل من اہل الحدیث فیقول ......حدیث نمبر:۲۰۹۱۱، ج۱۰، ص:۱۰، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع سوم، ۱۴۲۴ھ، ۲۰۰۳ء)

ہر آنے والی نسل سے عادل لوگ اس علم کے حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی اختراع اور جاہلوں کی تاویل کو دور کریں گے۔

حفاظت قرآن کے پردے میں در اصل اسلام کے تمام شعبوں عقائد، احکام، اخلاق و معاشرت، کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہ کی طرف سے کیا گیا ہے یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا مذہب مذاہب سابقہ کی طرح تحریف کا شکار نہیں ہوگا اسلام کے خلاف تحریف کی کوششیں اور سازشیں ہمیشہ ناکام ہوتی رہیں گی یہ مذہب تا قیامت اپنی اصلی حالت میں درخشندگی اور تابنا کی ساتھ باقی رہے گا۔ اور گم کردہ راہ انسانوں کے

لئے مینارۂ نور اور مشعل ہدایت کا کام دے گا۔

اسلام کے اساسی حصہ میں ائمہ کرام کا اتفاق:

جس طرح اسلامی احکام میں بندوں کی طرف سے اضافہ یا حک وفک تحریف فی الدین شمار ہوتا ہے اسی طرح مدراج احکام میں کسی قسم کی تبدیلی تحریف شمار ہوتی ہے، مدراج احکام سے میری مراد یہ ہے کہ کس حکم شرعی کو فرض مانا جائے، کس کو واجب، کس کو سنت یا مستحب، کس کو قطعی تسلیم کیا جائے کس کو ظنی، غرض یہ کہ اسلام کے مکمل نظام عقائد و اعمال میں کسے کیا حیثیت اور کیا مقام دیا جائے اس کی بنیادیں بھی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے فراہم کردی گئی ہیں۔ شریعت اسلامی کے وہ سارے اجزاء وعناصر جن کی عامۃ الناس کو حاجت تھی اور جن کی حیثیت دین میں اساسی تھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی تبلیغ اس شان سے کی کہ عام مسلمانوں میں وہ خوب شائع وذائع ہوگئے اور ہر نسل نے بعد والی نسل تک اسے اس طرح پہنچایا کہ ان میں تواتر وتوارث کی شان پیدا ہوگئی اور قطعیت پیدا ہوگئی، امام شافعی نے اس کو ”مانقلہ عامۃ من عامۃ“ سے تعبیر کیا ہے اور الرسالہ میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

”وھذا الصنف کلہ من العلم موجوداً نصاًفی کتاب اللہ وموجوداًعاماعند أھل الإسلام وینقلہ عوامھم عن من مضی من عوامھم یحکونہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم“ (الرسالہ لامام محمد بن ادریس الشافعی/۳۵۸، تحقیق وشرح احمد محمد شاکر، ناشر مصطفی البابی واولادہ، مصر، طبع اول، ۱۳۵۷ھ)۔

(اور یہ پوری قسم صراحتاً اللہ کی کتاب میں موجود ہے اور عموماً اہل اسلام کے پاس موجود ہے، عامۃ المسلمین اسے اپنے پیشرو عامۃ المسلمین سے نقل کرتے ہیں، اسی طرح یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچ جاتا ہے)۔

ضروریات دین اور شریعت اسلامی کا اساسی حصہ ”نقل العامۃ عن العامۃ“ یا ”نقل الکافۃ عن الکافۃ“ کی راہ سے ہر نسل تک پہونچتا رہا ہے جسے ہم تواتر سے بھی موسوم کرتے ہیں، تواتر کا لفظ سن کر فوراً ذہن تواتر اسنادی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور تواتر اسنادی ہی میں تواتر کو منحصر سمجھ لینے کی وجہ سے بعض حضرات دین کے متواتر حصہ کی مقدار بہت قلیل سمجھتے ہیں، علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۳۵۲ھ۔۱۹۳۳ء) اپنی گراں قیمت کتاب ”اکفار الملحدین فی ضروریات الدین“ میں اس غلط فہمی کا ازالہ فرماتے ہیں:

”ثم التواتر قد یکون من حیث الإسناد کحدیث من کذب علی متعمداً۔۔۔۔ وقد یکون من حیث الطبقۃ کتواتر القرآن، تواتر علی البسیطۃ شرقا وغربا، تلقاہ الکافۃ عن الکافۃ طبقۃ عن طبقۃ الی حضرۃ الرسالۃ ولا تحتاج الی اسناد یکون عن فلان عن فلان وقد یکون تواتر عمل وتواتر توارث وقد تجتمع أقسام کما فی أشیاء من الوضو کالسواک والمضمضۃ والاستنشاق، ثم ان التواتر یزعمہ بعض الناس قلیلا وھو فی الواقع یفوت الحصر فی شریعتنا ویعجز الانسان أن یفھرسہ ویذھل الانسان

عن التفاته فاذا التفت اليه رآه متواتراً وهذا كالبديهي كثيرا ما يذهل عنه ويحفظ النظريّ"۔(اکفار الملحدین فی ضروریات الدین/۴۰۵ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۰ھ)

(تواتر کبھی سند کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے "من کذب علی متعمدا" والی حدیث، کبھی تواتر طبقہ ہوتا ہے جیسے قرآن مشرق سے مغرب تک پوری دنیا میں متواتر ہے مسلمانوں کی ہر نسل نے پہلی والی نسل سے قرآن سیکھا ہے، قرآن میں سلسلۂ سند کی ضرورت نہیں ہے کبھی تواتر عمل اور تواتر توارث ہوتا ہے، کبھی تواتر کی متعدد قسمیں جمع ہو جاتی ہیں جیسے وضو کی چند چیزوں مثلاً مسواک، مضمضہ اور استنشاق میں۔

پھر تواتر کو بعض لوگ قلیل سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری شریعت میں تواتر سے ثابت شدہ امور بے شمار ہیں، انسان ان کی فہرست نہیں بنا سکتا، انسان ایک چیز کی طرف توجہ نہیں دے پاتا، جب ادھر توجہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز متواتر ہے، متواتر کا حال بدیہی کی طرح ہے، انسان اکثر بدیہی کو بھول جاتا ہے اور نظری کو یاد رکھتا ہے)۔

ضروریات دین اور شریعت اسلامی کے اساسی حصہ میں ائمہ مجتہدین میں کوئی اختلاف نہیں، اہل سنت والجماعت کے تمام مسالک جو "ما أنا عليه وأصحابي" کے زمرہ میں شامل ہیں شریعت اسلامی کے اس حصہ میں متفق ہیں اس میں اگر اختلاف ہے تو فرق ضالہ، باطلہ کا جنہیں اہل حق کافر یا مبتدع قرار دیتے ہیں۔

ائمہ کرام کے اختلاف کا دائرہ:

شریعت اسلامی کی مذکورہ بالا قسم کے بالمقابل احکام شریعت کی ایک قسم وہ ہے جو "خبر الواحد عن الواحد" "نقل الخاصة عن الخاصة" کی راہ سے ہم تک پہنچی ہے شریعت کے اس قسم کی حیثیت واہمیت پہلی قسم کے برابر نہیں ہے ان احکام کا "نقل الخاصة عن الخاصة" کی رہ سے ہم تک پہنچنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا منشا ہی یہ تھا کہ دین کا یہ حصہ "خبر الواحد عن الواحد" کی راہ سے ہم تک پہنچے تاکہ ان کے احکام کے مطالبہ میں پہلی قسم والی شدت پیدا نہ ہو، اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے بارے میں ایسا طرز اختیار فرمایا کہ ان میں شہرت وشیوع وتواتر کی شان پیدا نہ ہو سکی اسی طرح خلفاء راشدین نے بھی منشاء رسالت سے واقفیت کی بناء پر دین کے اس حصہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روش کو اختیار فرمایا، غرض یہ کہ دین کے اس حصہ کا خبر آحاد کی شکل میں منتقل ہونا یہ واقعہ ہوا نہیں بلکہ کیا گیا، شریعت اسلامی کے اسی دوسرے حصہ میں ائمہ مجتہدین کے اختلافات ہیں، یہ اختلافات ائمہ مجتہدین سے شروع نہیں ہوئے بلکہ صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی ان مسائل میں اختلاف تھا فقہاء وتابعین میں بھی وہ اختلاف قائم رہا، ان مسائل میں اختلاف کی نوعیت زیادہ تر افضل، غیر افضل، راجح، مرجوح کی ہے، جواز وعدم جواز صحت وفساد والے اختلافات دس فیصد بھی نہیں ہیں جواز وعدم جواز کا اختلاف شاذ ونادر ہونے کی وجہ سے علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ نے تو اس طرح کے مسائل کے بارے میں کلی طور پر لکھ دیا۔

”هم مخيرون في أن يفعلوا ما شائوا، وإنما الخلاف بين الفقهاء فيه في الأفضل منه“۔ (احکام القرآن للجصاص الرازی ۱/ ۲۴۸، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، پہلا ایڈیشن ۱۴۱۵ھ، ۱۹۹۴ء)

(ان کو اس بارے میں اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں، فقہاء کا اس کے بارے میں اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ افضل کیا ہے)۔

اس طرح کے اختلافی مسائل میں زیادہ تر صورت حال یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دونوں طرح کے عمل ثابت ہیں اس لئے فقہاء دونوں کو جائز کہتے ہیں، ان میں اختلاف صرف یہ ہے کہ افضل کون سا عمل ہے، صحابہ کرام کی ان اختلافات کے بارے میں مشہور مالکی عالم شاطبیؒ الموافقات میں حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر کا کتنا بلیغ اور حکیمانہ قول نقل کرتے ہیں:

”لقد نفع الله بخلاف أصحاب النبي صلى الله عليه وآله وسلم في أعمالهم لا يعمل العامل بعمل رجل منهم إلا راى أنه في سعة ورأى أن خير امنه قد عمله“۔ (الموافقات للشاطبی ۴/ ۱۲۵، ناشر دار المعرفۃ بیروت)

(اللہ تعالی نے صحابہ کرام کے اعمال میں اختلاف سے امت مسلمہ کو فائدہ پہونچایا، عمل کرنے والا ان میں سے کسی کے عمل کے مطابق عمل کرتا ہے تو اپنے لئے گنجائش محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھ سے بہتر شخصیت نے یہ عمل کیا تھا)۔

حضرت قاسم بن محمد کا شمار مدینہ کے فقہاء سبعہ میں ہوتا ہے آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں بچپن میں یتیم ہوجانے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کی زیر تربیت آگئے اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی آغوش شفقت وسایۂ عاطفت میں ہوش سنبھالا۔

دین کے فروعی حصہ میں امت کا اختلاف رحمت ہے:

جن حضرات کو اللہ تعالی نے قرآن وسنت کا رمز شناس اور مقاصد شریعت کا غواص بنایا انہوں نے ہمیشہ ان اختلافات کو امت کے لئے رحمت تصور کیا اور کسی ایک قول پر مسلمانوں کو مجبور کرنے کی شدید مخالفت کی، معلم العلماء خلیفہ عادل حضرت عمر بن عبد العزیز کے سامنے کسی نے تجویز رکھی کے کاش کہ آپ لوگوں کو ایک ہی مسلک پر متفق کر دیتے (لو جمعت الناس على شئى) تو انہوں نے جواب دیا۔

”ما يسرني أنهم لم يختلفوا“ یعنی اگر مسلمان مختلف نہ ہوتے تو یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ انہوں نے اسی جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ:

”ثم كتب إلى الآفاق وإلى الأمصار ليقض كل قوم بما اجتمع عليه فقهائهم“ (سنن الدارمی ۱/ ۴۸۹، باب اختلاف الفقہاء، حدیث نمبر: ٦٥٢)۔

(پھرانہوں نے اپنے تمام ممالک محروسہ کے ارباب علم و دانش کے نام فرمان بھیجا کہ ہر ملک کے باشندے اسی کے مطابق فیصلہ کریں جن پران کے فقہاء کا اتفاق ہو)۔

غرض یہ کہ مختلف علاقوں اور شہروں کے فقہاء کا جو اختلاف تھا اسے باقی رکھنے کا فرمان جاری کر دیا۔

امام مالکؒ کا واقعہ:

امام مالک علیہ الرحمۃ کا یہ واقعہ ان کے تمام سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ایک بار منصور نے حج کیا اور امام مالکؒ سے عرض کیا کہ میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں ان کی نقلیں کراؤں اور انہیں مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں بھیج کر فرمان جاری کر دوں کہ لوگ صرف انہیں کتابوں کے مطابق عمل کریں، ان سے متجاوز ہو کر کوئی اور طریقہ اختیار نہ کریں، خلیفہ منصور نے امام مالکؒ کے سامنے یہ پیشکش رکھی جو اپنی فوجی اور سیاسی طاقت کے اعتبار سے اس زمانہ میں دنیا کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا اگر مسائل فقہ اور احکام جزئیہ میں عام مسلمانوں کو کسی مسلک پر متفق کرنا مطلوب شرعی ہوتا یا اسلام میں اس کی گنجائش ہوتی تو امام مالکؒ جیسا اسلام اور مسلمانوں کا بہی خواہ اس زریں موقعہ سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا لیکن امام مالکؒ کا جواب سنئے:

”یا أمیر المومنین لا تفعل ھذا فإن الناس قد سبقت إلیھم الأقاویل وسمعوا أحادیث ورووا روایات، وأخذ کل قوم بما سبق إلیھم ودانوا بہ، فدع الناس وما اختار أھل کل بلد لأنفسھم“ (حجۃ اللہ البالغۃ للشیخ احمد بن عبدالرحیم المعروف بولی اللہ الدہلوی ۱/ ۱۴۴، الطبقۃ الاولی)۔

(امیر المومنین ایسا نہ کیجئے کیوں کہ لوگوں تک اس سے پہلے اقوال پہنچ چکے ہیں انہوں نے احادیث سنی ہیں، روایات کی ہیں، ہر قوم نے ان اقوال وروایات کو اختیار کر لیا ہے جو ان تک پہلے پہنچیں، لہذا لوگوں کو انہیں اقوال و روایات پر رہنے دیجئے جو ہر شہر والوں نے اپنے لئے پسند کیا ہے)۔

امام مالکؒ کا قول ”دع الناس وما اختار أھل کل بلد لأنفسھم“ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد ”لیقض کل قوم بما اجتمع علیہ فقھائھم“ اس باب میں قول فیصل ہے، ان دونوں حضرات کے اقوال سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس طرح کے مسائل خلافیہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کرنے اور اپنے دلائل پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنے مسلک کو رائج مقبول بنانے کے لئے اس طرح دعوت وتحریک چلانا جس سے مسلمان آبادیوں کا سکون درہم برہم ہو جائے اور معرکۂ حق وباطل کا شبہ ہونے لگے اس کی گنجائش نہیں۔

مجتہدین کے اختلافات فرقہ بندی نہیں ہیں:

خلاصۂ کلام یہ کہ ائمہ مجتہدین کے درمیان جو مسائل مختلف فیہ ہیں ان میں سے بیشتر وہی ہیں جو صحابہ کرام

کے دور میں بھی مختلف فیہ تھے، ان مسائل میں اختلاف کی وجہ سے ملت اسلامیہ کا غیر معمولی علمی فائدہ ہوا، علوم اسلامیہ کو ترقی ہوئی، بحث وتحقیق کے اعلیٰ ترین نمونے سامنے آئے، لیکن غیروں نے فقہی مسالک کے اس اختلاف کو جو امت اسلامیہ کے لئے سراسر رحمت ہے فرقہ بندی کا نام دیا اور سادہ لوح ناواقف مسلمان اس طعنہ سے شرمانے لگے حالانکہ فقہی مسالک کے اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں میں کبھی جنگ وجدال قتل وقتال کی نوبت نہیں آئی بلکہ چاروں ائمہ کی تقلید کرنے والے مسلمان باہم شیر وشکر رہے ان میں ہر طرح کی معاشرتی، علمی، سیاسی روابط ہے تذکرہ وتراجم کی کسی کتاب میں کسی بھی ملک کے ممتاز عالم ومحدث کا حال دیکھ لیجئے عموماً اس کے اساتذہ وشیوخ میں ہر مسلک کے لوگ ملیں گے، مولانا گیلانیؒ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کے افسانے کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اہل سنت میں جو اختلافات ہیں اور ان اختلافات کی بنیاد پر بطور نام نہاد لوگ مختلف ائمہ کی طرف سے منسوب ہیں، بتا چکا ہوں کہ علما ہو یا عملاً ان کے اختلافات کی وہ نوعیت ہی نہیں ہے جس سے فرقے بنتے اور ٹولیاں تیار ہوتی ہیں۔۔۔ اسی لئے باہم ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک والوں سے شادی بیاہ کے عام معاشرتی ہی نہیں بلکہ پیری مریدی تک کے تعلقات قائم کرنے سے نہیں جھجکتے، شروع سے لے کر اس وقت تک کا عام حال یہی رہا ہے، کہیں کہیں شخصی طور پر اگر کسی کے قلم سے یا زبان سے اور وہ بھی علمی مباحثوں یا مناظروں کے وقت کچھ بے احتیاطیاں عمل میں آئی ہیں تو اس کی ذمہ داری ان اختلافات پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کی بے احتیاطیاں تو ان لوگوں کے اندر بھی پائی جاتی ہیں جن میں یہ اختلافات نہیں ہیں، علمی ترنگ اور مناظراتی جوش میں بھر کر کیا حنفی عالموں نے اپنے ہی جیسے حنفی عالم پر چوٹ نہیں کی۔۔۔ لیکن یہ بے احتیاطیاں بھی کیا زبان وقلم سے آگے بڑھ کر کبھی تلوار کے قبضوں تک پہنچ گئی ہیں، اسلام تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے اس کی آبادیوں کا دائرہ ایشیا وافریقہ بلکہ یوروپ کے بعض خطوں کو محیط ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ حنفیوں کی فوج شافعیوں کے مقابلے میں یا مالکیوں کا رسالہ حنبلیوں کے مقابلہ میں اس لئے صف آرا کبھی کسی زمانہ میں ہوا تھا کہ ان میں ایک کا دوسرے سے مذہبی اختلاف تھا۔۔۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں جو کچھ ہوا وہ تو خیر ایک بڑی بات ہے میں نہیں جانتا کہ اہل سنت کے ان مختلف اماموں کے متبعین میں کبھی کوئی معمولی جھڑپ بھی ہوئی ہو۔ اور تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک دو واقعے اگر کہیں شاذ ونادر پیش آئے بھی ہوں تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ جھڑپ کی بنیاد میں درحقیقت کوئی دوسری چیز پوشیدہ تھی'' (تدوین فقہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، ص: ۱۳۵۔۱۳۶)۔

فن حدیث اور اختلاف ائمہ:

اختلاف ائمہ کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، اختلاف ائمہ کے اسباب کا موضوع بڑا طویل الذیل ہے موضوع کے غیر معمولی اہمیت کی بناء پر علماء اعلام نے اس موضوع پر قلم

اٹھایا اور انصاف وتحقیق کا حق ادا کیا، علامہ شعرانیؒ کی ''المیز ان الکبری'' ''کشف الغمۃ'' علامہ ابن تیمیہؒ کی، ''رفع الملام عن الائمۃ الاعلام'' شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی، ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' اس موضوع کی اہم کتابیں ہیں، دور حاضر کی تصنیفات میں الدکتور مصطفی سعید الخن کی ''اثر الاختلاف فی القواعد الاصولیۃ فی اختلاف الفقہاء'' اور شیخ محمد عوامہ کی ''اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ'' اس موضوع پر فکر انگیز، اور تحقیقی کتابیں ہیں خصوصاً آخر الذکر کتاب ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق ہے، زیر نظر مضمون میں شیخ عوامہ کی تصنیف سے بھر پور استفادہ کیا گیا ہے، ہمیں مختصراً اس موضوع پر روشنی ڈالنی ہے کہ ائمہ کے ختلافات میں علم حدیث کے کیا اثرات پڑے، ائمہ مجتہدین کا علم حدیث میں بلند پایہ مقام احادیث وآثار کے ذخیرہ پران کی وسیع نظر، رجال حدیث کی توثیق وتضعیف، احادیث کی تصحیح و پرکھ میں ان کا فنکارانہ اور مجتہدانہ مقام، ان موضوعات کو زیر بحث لانا بدیہی کونظر بنانا ہے، بعض اہل قلم نے مختلف محرکات کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کی حدیث دانی کو تنقید وتنقیص کا موضوع بنایا لیکن اہل تحقیق نے ہمیشہ امام صاحب کی مقام شناسی کا ثبوت دیا اور فن حدیث میں ان کی امامت اور وسعت نظر کا بڑے بلند الفاظ میں اعتراف کیا۔

حدیث رسول کی حجیت پر ائمہ کا اتفاق:

امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ائمہ مجتہدین (جن کی امت کا سواد اعظم تقلید کرتا ہے) علم وتقوی کی بلند ترین مقام پر فائز تھے اور مسائل کی تحقیق واستنباط میں پوری ژرف نگاہی، دیانت داری، تلاش وجستجو سے کام لیتے تھے، یہ سب حضرات قرآن کے بعد احادیث رسول کو احکام شریعت کا سب سے بڑا اور اہم ماخذ ومصدر تصور کرتے تھے ان میں کسی کے بارے میں یہ بدگمانی جائز نہیں کہ حاشا وکلا کسی مسئلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل پر مطلع ہونے کے بعد اس کی مخالفت کی جرأت کرتے تھے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ امت میں جن ائمہ کو قبولیت عامہ حاصل ہے ان میں سے کوئی بھی عمداً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی چھوٹی یا بڑی سنت کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔

کیوں کہ وہ سارے ائمہ یقینی طور پر اتباع رسول کے وجوب پر اور اس بات پر متفق تھے کہ کسی بھی شخص کا قول قبول کیا جا سکتا ہے یا چھوڑا جا سکتا ہے سوائے قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے، لہذا اگر کسی امام کا کوئی ایسا قول پایا جائے جس کے خلاف حدیث صحیح وارد ہے تو لامحالہ اس امام کے پاس اس حدیث کو ترک کرنے میں کوئی عذر ہوگا، اور کل اعذار تین ہیں۔

۱- ان کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ یہ رسول کا فرمان ہے۔

۲- ان کا یہ خیال ہو کہ نبی اکرمؐ نے اس فرمان سے یہ حکم مراد نہیں لیا ہے۔

۳- ان کا یہ خیال ہو کہ یہ حکم منسوخ ہے (اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقہاء للشیخ محمد عوامۃ

الطبعة الثانیہ ۹۱)۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

”إیاکم والقول فی دین الله بالرأی وعلیکم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل“ (المیزان الکبری الشعرانی ۱/۶۷ الطبعة الثانیہ ۱۳۱۸ھ)۔

(تم لوگ دین کے بارے میں کوئی بات رائے سے کہنے سے بچو اور اتباع سنت کو لازم پکڑو کیوں کہ جو شخص سنت سے باہر گیا گمراہ ہوا)۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

”أی سماء تظلنی وأی أرض تقلنی إذا رویت عن النبی ﷺ حدیثا وقلت بغیره“ (اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمة الفقہاء للشیخ محمد عوامة الطبقہ الثانیہ ۹۱)۔

(کون آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اگر میں نبی اکرمؐ سے ایک حدیث روایت کروں اور اس کے خلاف مذہب اختیار کروں)۔

اسی طرح کے اقوال دوسرے ائمہ مجتہدین کے بھی کثرت سے منقول ہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ حضرات سنت رسول کی دیدہ ودانستہ مخالفت کریں۔اس لئے آیئے جائزہ لیں کہ بسا اوقات بعض اہل علم اور طالب علموں کو ائمہ کے بعض اقوال کے بارے میں مخالف سنت کا جو شبہ ہونے لگتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں اور ان کے عذر و توجیہ کیا ہے۔

اختلافات کے چند اہم اسباب:

علم حدیث کے سلسلے میں ائمہ مجتہدین کے اختلاف کے اسباب کو چند بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) خبر واحد کے قابل استدلال و حجت شرعی ہونے کے لئے کیا کیا شرطیں اور اوصاف ضروری ہیں اس بارے میں ائمہ مجتہدین کے اصولی اختلافات (۲) فہم حدیث میں ان کا اختلاف (۳) احادیث صحیحہ کے متعارض ہونے کی صورت میں کیا موقف اختیار کیا جائے، قابل استدلال متعارض حدیثوں میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے اسباب کیا ہوں اس سلسلہ میں ائمہ کے اصولی اختلافات (۴) احادیث پر اطلاع اور نظر کے سلسلہ میں ان کا باہمی فرق۔

حدیث کی تصحیح کے اصول میں اختلافات:

اختلاف کے ان چاروں بنیادی اسباب میں پہلا سبب سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اگر اس پر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، ہم یہاں مختصراً چند اشارے کرتے ہیں، اصول حدیث کی کتابوں میں حدیث صحیح میں پانچ شرطیں لگائی گئی ہیں (۱) اتصال سند (۲) عدالت راوی (۳) راوی کا ضابط ہونا (۴) سند و متن کا

شذوذ سے خالی ہونا (۵) سند ومتن کا علل قادحہ سے خالی ہونا۔

اتصال سند کی تفصیل میں خود گروہ محدثین میں شدید اختلاف ہے عنعنہ کی صورت میں امام بخاری وغیرہ کے نزدیک اتصال سند کے لئے ضروری ہے کہ راوی اور اس کے شیخ میں کم از کم ایک بار لقاء ثابت ہو اور امام مسلم نے مقدمہ مسلم میں لقاء کی شرط نہ ہونے پر اجماع کا دعوی کیا اور انہوں نے امکان لقاء کو کافی تصور کیا ہے، ذرا غور کیجئے کہ اس اختلاف سے کتنی حدیثوں کے بارے میں اختلاف ہو جائے گا، امام بخاری اور ان کے ہم مسلک حضرات کے نزدیک وہ تمام معنعن حدیثیں دائرہ صحت سے خارج ہو جائیں گی جس کے سلسلۂ سند میں کسی ایک راوی اور اس کے شیخ کے درمیان لقاء ثابت نہ ہو سکا، خواہ اس میں صحت حدیث کی دوسری تمام شرطیں پائی جائیں اور امام مسلم وغیرہ کے نزدیک صرف لقاء کا ثبوت نہ ملنے سے حدیث کے صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جب کہ اس میں صحت کی تمام دوسری شرطیں موجود ہیں، اتصال سند ہی کے موضوع سے وابستہ ایک مسئلہ احادیث مرسلہ کا ہے محدثین عموماً احادیث مرسلہ کو ضعیف نا قابل استدلال قرار دیتے ہیں لیکن ائمہ مجتہدین اور فقہاء عام طور پر مراسیل کو حجت قرار دیتے ہیں۔

حدیث مرسل کے بارے میں اختلاف:

مشہور شافعی اصولی وفقیہ علامہ سیف الدین آمدی ''الاحکام فی اصول الاحکام'' میں لکھتے ہیں:

حدیث مرسل کی قبولیت کے بارے میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام احمدؒ (مشہور ترین روایت کے اعتبار سے) اور جمہور معتزلہ نے مرسل کو قبول کیا ہے احناف میں سے عیسی بن ابان نے اس میں تفصیل کی ہے، انہوں نے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور ائمہ حدیث کے مراسل کو قبول کیا ہے، دوسروں کے مراسل کو نہیں، امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر مرسل صحابہ کے مراسیل میں سے ہے یا ارسال کرنے والے کے علاوہ کسی نے اسے سند کے ساتھ ذکر کیا ہے یا کسی اور راوی نے بھی اسے مرسل ذکر کیا ہے جس نے پہلے ارسال کرنے والے کے علاوہ دوسرے شائخ سے روایت کی ہے یا اس حدیث مرسل کی تائید کسی صحابی کے قول یا اکثر اہل علم کے مسلک سے ہوتی ہے یا ارسال کرنے والے کے بارے میں بھی معلوم ہے کہ وہ ایسے راویوں سے روایت نہیں کرتا جن میں کوئی علت یعنی جہالت وغیرہ ہو مثلاً ابن المسیبؒ کے مراسیل تو مرسل قبول کر لی جائے گی ورنہ نہیں، امام شافعیؒ کے اکثر شاگردوں نے نیز قاضی ابوبکر اور فقہاء کی ایک جماعت نے امام شافعیؒ کے مسلک سے اتفاق کیا ہے۔ مختار یہ ہے کہ عادل شخص کے مراسل مطلقاً قابل قبول ہیں۔ اس کی دلیل اجماع اور عقل ہے (الاحکام فی اصول الأحکام، ج ۲ ص: ۱۷۷۔ ۱۷۸، للعلامہ الآمدی الشافعی دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

ابن جریر طبریؒ کا یہ دعوی تو صحیح نہیں کہ مرسل کے قبول کرنے پر تابعین کا اجماع ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ تابعین بلکہ تبع تابعین کے عہد تک مرسل کو قبول کرنے اور اس سے استدلال کرنے کا ارباب علم وفقہ میں عام رواج

تھا بعض ارسال کرنے والوں کا حال تو یہ تھا:

”روی عن الأعمش أنه قال: قلت لإبراهیم النخعی: إذا حدثنی فأسند فقال: إذا قلت لک حدثنی فلان عن عبد اللہ فھو الذی حدثنی، وإذا قلت لک: حدثنی عبداللہ فقد حدثنی جماعة عنه“۔ (الاحکام فی اصول الأحکام، للآمدی، ج ۲ ص: ۱۲۴، المسالۃ العاشرۃ قبول الخبر المرسل، المکتب الاسلامی، دمشق ۱۴۰۲ھ)

(اعمش سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے ابراہیم نخعی سے عرض کیا جب آپ مجھ سے حدیث بیان کریں تو پوری سند ذکر فرمایئے انہوں نے فرمایا کہ جب میں تم سے بیان کروں کے فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ اس نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تنہا اسی شخص سے وہ روایت سنی اور اگر تم سے یہ کہوں کہ یہ عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے (یعنی اپنے شیخ کا ذکر نہ کروں) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے متعدد اصحاب نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے)۔

اس لئے بعض حضرات نے کہہ دیا:

”من أسند فقد أحالک و من أرسل فقد تکفل لک“

(جس شخص نے پوری سند ذکر کی اس نے حدیث کی تحقیق تمہارے ذمہ کردی اور جس نے ارسال کیا اس نے تمہارے لئے ذمہ داری قبول کی)۔

ارسال کے مسئلہ میں اس اصولی اختلاف کی بناء پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق وہ سیکڑوں حدیثیں ضعیف قرار پاتی ہیں جن میں ارسال پایا جاتا ہے جب کے ائمہ مجتہدین کے نزدیک وہ احادیث قابل استدلال اور حجت ہیں، امام شافعیؒ ان تمام مراسیل کو مسترد کردیتے ہیں جن میں مویدات اربعہ یا خمسہ میں سے کوئی ایک موید بھی نہیں پایا جاتا جب کہ دوسرے ائمہ ان سے استدلال کرتے ہیں، علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں:

”من ضعف الحدیث بالإرسال نبذ شطر السنة المعمول بھا“ (تانیب الخطیب للکوثری، ص: ۱۵۳، دارالسلام، مصر ۲۰۲۰ء)۔

جس شخص نے ارسال کی بنیاد پر حدیث کو ضعیف قرار دیا اس نے معمول بہا سنت کا نصف ترک کردیا۔

عدالت راوی کے بارے میں اختلاف:

صحت حدیث کی دوسری شرط عدالت راوی ہے اس شرط کی تفصیل وتحدید میں اختلاف کا وسیع میدان ہے، عدالت کا مفہوم کیا ہے، کیا عدالت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ راوی مسلمان ہو اس کے بارے میں جرح ثابت نہ ہو، یا اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی عدالت ظاہرہ ثابت ہو جسے اصطلاح میں مستور کہتے ہیں، یا عدالت

ظاہرہ کے ساتھ عدالت باطنہ کا ثبوت بھی ضروری ہے، اگر عدالت باطنہ ضروری ہے تو کیا ایک امام جرح و تعدیل کی تعدیل و توثیق کافی ہے یا دو ائمہ کی طرف سے تعدیل ضروری ہے، عدالت ہی کے مسئلہ سے یہ بحث بھی متعلق ہے کہ کون سے افکار و اعمال عدالت کو ختم کرنے والے ہیں کون سی جرح معتبر ہے کون غیر معتبر، اور فلاں راوی کے بارے میں جرح ثابت ہے کہ نہیں ہے، جرح و تعدیل کرنے والے بھی آخر انسان ہی تھے، انسانی نفسیات اور انسانی کمزوریوں سے پاک نہیں تھے کہیں راوی پر جرح کرنے کا محرک معاصرتی چشمک مسلکی یا نظریاتی اختلاف تو نہیں، یا جرح کی بنیاد ناواقفیت اور غلط اطلاعات تو نہیں ہیں، یا چونکہ انہوں نے خلق القرآن کی ابتلاء میں عام محدثین سے الگ روش اختیار کی اس لئے ان پر تنقید کی گئی، خصوصاً خلق قرآن کے مسئلہ کا فن اسماء الرجال اور جرح و تعدیل پر غیر معمولی اثر پڑا۔

جرح و تعدیل پر فتنہ خلق قرآن کے اثرات:

فتنہ خلق قرآن کی تفصیل کا نہ موقع ہے نہ ضرورت، ۲۱۸ھ سے لے کر ۲۳۲ھ تک اس فتنہ کی شدت رہی، خلق القرآن کے داعیوں نے حکومت وقت کو ہم نوا بنا کر شمشیر کی نوک پر تمام مسلمانوں خصوصاً فقہاء و محدثین، ارباب علم کو اس کا قائل کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں بے پناہ مظالم کئے، اکثر لوگوں نے جان و مال بچانے کے لئے رخصت کی راہ اپنا کر زبانی ہم نوائی کر دی لیکن ایک جماعت نے عزیمت کی راہ اپنائی جن کے سرخیل امام احمدؒ بن حنبل تھے، ان حضرات نے ہر طرح ظلم و ستم برداشت کئے لیکن اس بات کی اجازت نہ دی کہ اسلام کے عقائد اساسیہ میں ایک اور عقیدہ کا اضافہ کیا جائے، ۲۳۲ھ میں متوکل کے حکم سے یہ فتنہ فرو ہوا، ۲۳۴ھ میں قرآن کو مخلوق کہنے کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا گیا، اور حکومت وقت احمدؒ بن حنبل کے موقف کی مؤید بن گئی، معتزلہ کے اس عمل کا ردعمل بھی اسی شدت سے ہوا، غیر مخلوق کہنے والوں نے زور باندھا اور بعض نے اس حد تک غلو کیا کہ جس کاغذ پر قرآن لکھا گیا اسے بھی مخلوق قرار دینے لگے اور اتفاق نہ کرنے والوں کو مبتدع اور پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دینے لگے، جس عالم، محدث، راوی نے بھی اس مسئلہ میں توقف کیا یا اعتدال کی بات کہی اسے متروک اور مبتدع قرار دے دیا گیا، کبار محدثین تک اس کی زد میں آ گئے، امام بخاری یحی بن معین، علی ابن مدینی، یزید بن ہارون، زہیر بن حرب وغیرہ جلیل القدر ائمہ حدیث بھی اس خطرناک ردعمل سے نہیں بچ سکے، نیشاپور کے علماء و عوام نے محمد بن یحی ذہلی کی سربراہی میں امامؒ بخاری کا بے مثال استقبال کیا، نیشاپور کے تمام فقہاء و محدثین ان کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے، لیکن اللفظ بالقرآن سے متعلق سوال کے جواب میں جب امام بخاریؒ نے فرمایا "أفعالنا مخلوقة و ألفاظنا من أفعالنا" (ہمارے افعال مخلوق ہیں ہمارے الفاظ بھی ہمارے افعال میں سے ہیں) تو پورے نیشاپور میں تہلکہ مچ گیا جس کی گونج دور دور سنائی پڑی اس کے بعد نیشاپور میں امام بخاری کے ساتھ جو برتاؤ ہوا وہ تاریخ اسلام کے لئے ایک دھبہ ہے۔

محمد بن یحی الذہلی نے ان الفاظ میں امام بخاری کے بائکاٹ کا اعلان کیا، قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں

ہے جس کا خیال یہ ہو کہ میرا قرآن کو پڑھنا، تلفظ کرنا مخلوق ہے وہ بدعتی ہے نہ اس کے ساتھ ہم نشینی کی جائے نہ اس سے بات چیت کی جائے جو شخص اس کے بعد محمد بن اسمٰعیل بخاری کے پاس جائے اسے تم متہم سمجھو اس کی مجلس میں وہی حاضر ہوگا جو اس کے مسلک پر ہوگا۔

اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ مسلم بن الحجاج اور احمد بن سلمہ کے علاوہ سب تلامذہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، امام مسلم نے بھی بعد میں خدا جانے کن اسباب کی بناء پر اپنی الجامع الصحیح میں امام بخاری سے روایت نہیں کی، ذہلی کی مرویات پہلے ہی واپس کر چکے تھے، حافظ ابن حجرؒ نے ''هدی الساری لفتح الباری'' میں امام مسلم کے اس طرز عمل کے بارے میں لکھا ہے:

''قلت وقد أنصف مسلم فلم يحدث فی کتابه عن هذا، ولا عن هذا'' (ہدی الساری، ص: ۴۹۱، المکتبۃ السلفیۃ، مصر)۔

(میں کہتا ہوں کہ امام مسلم نے انصاف سے کام لیا انہوں نے اپنی کتاب میں نہ ذہلی سے روایت کی نہ بخاری سے)۔

غالباً یہ انصاف کی کوئی نئی قسم ہو۔

مسئلہ ذہلی اور ان کے تلامذہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ محمد بن یحیي ذہلیؒ نے دوسرے محدثین تک ینشاپور کے واقعہ کی اطلاع بھیجی ابن ابی حاتم نے ''الجرح والتعدیل'' میں بخاری کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری ۲۵۰ھ میں رے تشریف لائے ان سے میرے باپ ابوحاتم رازی اور ابوزرعہ رازی نے روایات سنیں پھر جب ان دونوں کے پاس محمد بن یحییٰ نیشاپوری نے لکھا کہ بخاری نے اہل ینشاپور کے سامنے ''اللفظ بالقرآن مخلوق'' کا نظریہ ظاہر کیا تو ان دونوں حضرات نے بخاری سے روایت کرنا ترک کردیا (الجرح والتعدیل قسم ۲ ج ۳/ ۱۹۱، الطبعۃ الاولی ۱۹۵۲ء)۔

''اللفظ بالقرآن مخلوق'' ہی کے مسئلہ کی وجہ سے عقیلي نے علی بن المديني جیسے سرتاج محدثین کو کتاب الضعفاء میں ذکر کردیا، حافظ ذہبی کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور میزان الاعتدال میں ان کے نوک قلم سے ان جملوں کی تراوش ہوئی۔

''أفمالک عقل يا عقيلي؟ أتدری فيمن تتكلم؟ وإنما أشتهي أن تعرفني من هو الثقه الثبت الذی ماغلط ولا انفرد بما لا يتابع عليه'' (میزان الاعتدال ج ۳/ ۱۴۰ ـ ۱۴۱ دارالمعرفۃ بیروت)

(اے عقیلي کیا تیرے پاس عقل نہیں ہے، کیا تجھے معلوم ہے تو کس کے بارے میں کلام کررہا ہے، تم ذرا یہ بتاؤ کہ ایسا کون ثقہ مستند شخص ہے جس سے کبھی غلطی نہ ہوئی ہو اور جس کا ایسا تفرد نہ ہو جس کی متابعت نہ کی جاتی ہو)۔

امام احمد بن حنبلؒ ہی کے تقریباً ہم رتبہ امام شافعیؒ کے مایہ ناز شاگرد حسین کرابیسیؒ ہیں ان کے حالات میں ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں:

حسین کرابیسی اور احمد بن حنبلؒ کے درمیان گہری دوستی تھی جب خلق القرآن کے مسئلہ میں حسین کرابیسیؒ نے احمد بن حنبلؒ کی مخالفت کی تو یہ دوستی عداوت میں تبدیل ہوگئی اس کے بعد دونوں ایک دوسرے پر طعن کرنے لگے، احمد بن حنبلؒ کے شاگرد حنابلہ نے حسین کرابیسی سے روایت کرنا ترک کردیا انہیں بدعتی قرار دیا اور ان پر طعن کیا اسی طرح خلق قرآن کے مسئلہ میں جو لوگ بھی حسین کرابیسی کے مسلک پر تھے ان سب پر طعن کیا (قواعد فی علوم الحدیث، ص:۳۷۰۔۳۷۱، تحقیق عبدالفتاح ابوغدہ مکتب المطبوعات الاسلامیہ بیروت)۔

غرض یہ کہ بڑے بڑے جلیل القدر حفاظ و نقاد حدیث مسئلہ خلق قرآن کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے، ان بڑوں کی طرف سے دفاع کرنے والے تو گروہ محدثین میں مل گئے لیکن سیکڑوں رواۃ حدیث جو زیادہ ناموری اور مقبولیت کے مالک نہیں تھے اب بھی اسی طرح کی جرحوں کی وجہ سے ساقط الاعتبار قرار دیئے جاتے ہیں، جرح و تعدیل کی کتابیں اس طرح کی جرحوں سے معمور ملیں گی۔

"فلان من الواقفة الملعونة" "فلان من اللفظية الضالة"

"لا يستثنى في الإيمان مرجى ضال" "كان لا يقول: الإيمان قول و فعل فتركناه"

ابن قتیبہ دینوری کا چشم کشا بیان:

ابن قتیبہ کی پیدائش ۲۱۳ھ اور وفات ۲۷۶ھ میں ہوئی، انہوں نے خلق قرآن کے فتنہ اور اس کے ردعمل کا پورا دور دیکھا انہوں نے اسی موضوع پر "الاختلاف فی اللفظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کا مطالعہ کرکے اس فتنہ اور اس کے ردعمل کی غیر معمولی شدت اور محدثین کی صفوں میں اس کے مہلک ترین اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، موصوف اللفظ بالقرآن کے مسئلہ میں محدثین کے دونوں گروہوں اور راویوں کی شدت اور انتہاپسندی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

طالب حقیقت جویائے حق کو دونوں فریقوں کی طرف سے آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے دونوں فریق اس پر بیجا سختی سے کام لیتے ہیں، اس کی آزمائش کرتے ہیں، اپنے مخالف کے ساتھ انتہائی درشت رویہ اپناتے ہیں، اپنے مخالف کی تکفیر کرتے ہیں، اور مخالف کی تکفیر میں شک کرنے والے کی تکفیر کرتے ہیں، بسا اوقات کوئی شیخ شہر میں وارد ہوتا ہے اور حدیث کی روایت کے لئے بیٹھتا ہے وہ ادب و تمیز سے آراستہ نہیں ہے اس کی وجہ فضیلت صرف یہ ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہے اور اس نے ابن عیینہ، ابو معاویہ، یزید بن ہارون وغیرہ کبار محدثین سے احادیث سنی ہیں، اس شیخ سے احادیث لکھنے سے پہلے یہ لوگ خلق القرآن کے مسئلہ میں اس کی آزمائش کرتے ہیں، سوال کرنے والوں کو حسب

منشاء جواب دینے سے قبل اگر غریب نے پس وپیش یا توقف کیا یا کھانسنے یا کھنکھارنے لگا تو اس کی شامت آجاتی، مجبوراً ان کے طعن وتشنیع اور ساقط الاعتبار قرار دیئے جانے کے خوف سے وہ بیچارہ ان کو خوش کرنے والا جواب دیتا لہٰذا علم کے بغیر کلام کرتا اور بغیر سمجھے جواب دیتا جس مجلس میں وہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی امید میں بیٹھا تھا اس میں اللہ تعالی سے اور دور ہو جاتا۔۔۔۔۔۔اور اگر کسی نوعمر طالب حقیقت یا ادھیڑ طالب علم کو دیکھتے اس کا نظریہ خلق قرآن کے مسئلہ میں دریافت کرتے اگر اس بیچارے نے یہ کہہ دیا کہ ابھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا ہوں۔۔۔۔۔۔تو اسے جھٹلاتے، ایذاء پہونچاتے اور کہتے: یہ خبیث ہے اسے ترک کردو اور اس کے پاس نہ بیٹھو(الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبھۃ۔للامام ابی محمد عبداللہ بن مسلم قتیبہ الدینوری ۲۶ مکتبۃ القدسی القاہرہ ۱۳۴۹ھ)۔

چند اور اصولی اختلاف:

محدثین کی اصطلاح میں صحت حدیث کی تیسری شرط حدیث کے ہر راوی کا تام الضبط ہونا ہے۔عام محدثین ضبط کی دونوں قسموں یعنی ضبط صدر اور ضبط کتاب کا اعتبار کرتے ہیں،لیکن امام ابوحنیفہؒ اس بارے میں ایک شدید شرط لگاتے ہیں کہ حدیث کے حجت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ راوی نے تحمل(سننے) سے لے کر اداءً(بیان) کے وقت تک اس حدیث کو یاد رکھا ہو،اس پوری مدت میں اسے حدیث کا نسیان پیش نہ آیا ہو(شرح مسند ابی حنیفہ لملاعلی قاریؒ،ص:۷ دارالکتب العلمۃ بیروت ۱۴۰۵ھ)۔یہ شرط لگا دینے کی وجہ سے بہت سی احادیث کی تصحیح وتضعیف کے بارے میں دوسرے ائمہ ومحدثین سے ان کا اختلاف لازمی ہے۔

اسی طرح صحت حدیث کی بقیہ شرطوں کے بارے میں بھی ائمہ اور محدثین میں اختلاف ہیں،بہت سی علل کو محدثین صحت حدیث میں قادح قرار دیتے ہیں حالانکہ فقہاء ان علل کو قادح تصور نہیں کرتے،اصول حدیث کی کتابوں میں مذکور صحت حدیث کی شرطوں سے قطع نظر ائمہ احناف نے خبر واحد کے قابل استدلال ہونے کے لئے چند مزید شرطیں لگائی ہیں،مولانا ظفر احمدؒ تھانوی نے ان پر تفصیلی کلام کرنے کے (قواعد فی علوم الحدیث،ص:۱۲۶،تحقیق عبدالفتاح ابوغدہ مکتب المطبوعات الاسلامیہ بیروت)بعد ان کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے:

”مذکورہ بالا تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک حدیث کی صحت کے لئے راوی کے عادل اور ضابط ہونے کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ صدر اول میں اس سے اعراض نہ کیا گیا ہو نہ وہ حدیث صدر اول میں متروک العمل رہی ہو، نہ ہی وہ حدیث عموم بلوی والے مسئلے میں خبر شاذ ہو بلکہ وہ حدیث ظاہر اور مروج ہو،ہمارے حنفی اصولیوں نے ہمیں ان شرطوں کے بارے میں دلیل پیش کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے کیوں کہ وہ لوگ اپنی کتابوں میں اس بحث سے فارغ ہو چکے ہیں“۔

اوپر ذکر کردہ صحت حدیث کی پانچوں شرطیں حدیث مقبول کی چار قسموں میں سے صحیح لذاتہ میں ضروری ہیں

حدیث مقبول کی باقی تین قسموں صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ کو جمہور محدثین بھی قابل استدلال اور حجت شرعی قرار دیتے ہیں اور فضائل اعمال کے علاوہ احکام شرعیہ میں بھی ان سے استدلال درست قرار دیتے ہیں، ہاں حدیث ضعیف کی حجیت کے بارے میں اختلاف ہے، جمہور علماء وفقہاء امت چند شرطوں کے ساتھ فضائل اعمال و مستحبات کا اثبات درست قرار دیتے ہیں، احکام شرعیہ یعنی حلال وحرام وغیرہ کے مسائل میں حدیث ضعیف کا قابل استدلال ہونا مختلف فیہ ہے، ائمہ مجتہدین میں سے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ احادیث ضعیفہ سے احکام شرعیہ میں بھی استدلال کرتے ہیں، اور قیاس جو ایک متفق علیہ مصدر تشریعی ہے اس پر حدیث ضعیف کو ترجیح دیتے ہیں، محدثین میں سے ابوداؤد ونسائی، ابن ابی حاتم کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن یہ لوگ حدیث ضعیف کے قابل استدلال ہونے کے لئے دو شرطیں لگاتے ہیں (۱) اس کا ضعف بہت شدید نہ ہو (۲) اس مسئلہ میں حدیث ضعیف کے سوا کسی کوئی اور حدیث نہ پائی جائے۔

احکام شریعت میں احادیث ضعیفہ ایک دوسرے طریقے سے بھی کام آتی ہیں، (اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقہاء، ص:۱۲۸، الطبقہ الثانیہ بحوالہ تحفۃ المودود لابن قیم والمجموع للنووی) اگر حدیث صحیح میں کوئی ایسا لفظ استعمال ہوا ہو جس کے دو یا چند معانی ہیں، اور سیاق وسباق سے کسی ایک معنی کی تعیین یا ترجیح ممکن نہیں ہے اور ایک حدیث ضعیف سے ایک معنی کی ترجیح ہوتی ہے تو اس معنی کو مراد لیا جائے گا جس کو حدیث ضعیف متعین کررہی ہے، انہیں مختلف وجوہ کی بنا پر ہمارے فقہاء ومحدثین کی نظر میں احادیث ضعیفہ کی بھی بڑی قدرت و قیمت رہی ہے، اس لئے دور حاضر میں جو لوگ دین کی خدمت کے عنوان سے احادیث ضعیفہ اور احادیث موضوعہ دونوں کو ایک ہی پلڑے میں تول کر سب کو ایک ساتھ دریا برد کرنا چاہتے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔

ائمہ مجتہدین کے اختلافات کا دوسرا بنیادی سبب فہم حدیث میں ان کا اختلاف ہے، بے شمار موقع پر ایسا ہوتا ہے کہ دو مجتہد ایک خبر واحد کی صحت و حجیت پر متفق ہوتے ہیں لیکن حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں ان میں اختلاف ہوتا ہے، کتب حدیث وفقہ کے مطالعہ کے دوران ہم لوگوں کے سامنے اس کی بے شمار مثالیں آتی رہتی ہیں، اس لئے اس سبب پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

متعارض احادیث کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا جائے؟

متعارض احادیث کے باب میں کیا موقف اختیار کیا جائے، اس بارے میں بھی ائمہ کرام کا اختلاف بے شمار مسائل میں اختلاف کا سبب ہے، علامہ کشمیری لکھتے ہیں:

”اعلم أن الحديثين إذا كان بينهما تعارض فحكمه عندنا أن يحمل أولا على النسخ فيجعل أحدهما ناسخا والآخر منسوخا ثم ينزل إلى الترجيح فإن لم يظهر وجه ترجيح أحدهما على الآخر

يصار إلى التطبيق فإن أمكن فبها وإلا إلى التساقط، هذا هو الترتيب عندنا كما في التحرير وعند الشافعية يبدا أولا بالتطبيق ثم بالنسخ ثم بالترجيح ثم بالتساقط" (فیض الباری للعلامہ محمد انور الکشمیری ۱/ ۵۲، ربانی بکڈپو دہلی)۔

(دوحدیثوں میں تعارض کی صورت میں ہمارے نزدیک حکم یہ ہے کہ پہلے اسے نسخ پرمحمول کریں گے، ایک کو ناسخ دوسری حدیث کو منسوخ قرار دیا جائے گا، اگر اس کا امکان نہ ہو تو ترجیح کا راستہ اختیار کیا جائے گا، اگر کسی ایک کے لئے بھی وجہ ترجیح نہ ہو تو تطبیق کی کوشش کی جائے گی، اگر تطبیق ممکن نہ ہوئی تو دونوں کو ساقط قرار دیا جائے گا، ہمارے نزدیک یہی ترتیب ہے جیسا کہ صاحب التحریر نے لکھا ہے شافعیہ کے نزدیک ترتیب یہ ہے (۱) تطبیق (۲) نسخ (۳) ترجیح (۴) تساقط)۔

احادیث میں ناسخ ومنسوخ کی معرفت بڑا ضروری اور مشکل فن ہے، حازمی نے "الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں سند کے ساتھ زہری کا یہ قول نقل کیا ہے،

"أعيى الفقهاء وأعجزهم أن يعرفوا ناسخ حديث رسول الله ﷺ من منسوخه" (الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار ۳۔ ۲ الطبعۃ الاولی)۔

احادیث رسول میں ناسخ ومنسوخ کی تمیز نے فقہاء کو عاجز ودرماندہ کردیا ہے، حازمی ہی نے یہ روایت نقل کی ہے۔

"مرّ عليٌ على قاص فقال تعرف الناسخ من المنسوخ، قال: لا، قال: هلكت وأهلكت" (حوالہ بالا ۴)۔

(حضرت علیؓ کا ایک واعظ کے پاس سے گزر ہوا، تو آپ نے واعظ سے پوچھا، تم ناسخ ومنسوخ میں تمیز کر لیتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: تم خود بھی ہلاک ہوئے دوسروں کو بھی ہلاک کیا)۔

ترجیح کے اسباب:

بعض احادیث کو بعض پر ترجیح دینے کا عمل مختلف ائمہ کے یہاں مختلف اصولوں پر مبنی ہے۔ امام شافعیؒ عموماً اصح اسناد کو اختیار کرتے ہیں، امام مالکؒ کے نزدیک سب سے بڑا مرجح عمل اہل مدینہ اور فقہاء سبعہ کا مسلک ہے، امام ابوحنیفہؒ قرآن وحدیث وسنت مشہورہ سے مستنبط دینی اصول اور صحابہ کرام خصوصاً خلفاء راشدین کے فتوی وعمل سے مطابقت کو زبردست مرجح تصور کرتے ہیں، علماء امت نے ایک حدیث کی دوسری حدیث پر ترجیح کے بہت سے اسباب لکھے ہیں، ابوبکر محمد بن موسی حازمی نے الاعتبار میں ترجیح کے پچاس اسباب ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"وثم وجوه كثيرة أضربنا عن ذكرها كيلا يطول به هذا المختصر" (کتاب الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار للحافظ ابی بکر محمد بن موسی الحازمی، ۱۲۳، الطبعۃ الاولی ۱۳۴۶ھ)۔

حافظ عراقی نے ''التقیید والایضاح'' میں حازمی کے ذکر کردہ وجوہ کو نقل کرنے کے بعد مزید وجوہ ترجیح تحریر فرمائے اور ان کی تعداد ایک سو دس تک پہنچانے کے بعد لکھا ''ثم وجوه أخرى للترجيح وفي بعضها نظر'' (التقیید والایضاح شرح مقدمۃ ابن الصلاح للعراقی ص:۲۵۰، دار الحدیث للطباعۃ والنشر والتوزیع بیروت)۔

حافظ عراقی نے لکھا:

''كون الحديث المروي في الصحيحين راجحا على حديث آخر غير مروي فيهما'' (حوالہ بالا ۲۵۰) صحیحین میں روایت کردہ حدیث کا غیر صحیحین کی روایت پر ترجیح حاصل ہونا۔

ذرا غور کیجئے کہ حدیث کا صحیحین میں ہونا سو سے زائد اسباب میں سے محض ایک سبب ہے، جس کا حازمی نے تو ذکر نہیں کیا اور عراقی نے بھی اسے ۱۰۲ نمبر پر ذکر کیا، لیکن اس دور کے بعض مدعیان علم وتحقیق سارے اسباب سے غافل ہو کر صرف اسی ایک سبب کو لے کر بے محابا راجح ومرجوح کا فیصلہ کرتے رہتے ہیں، یہ طرز کہاں تک تحقیق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

اختلاف ائمہ کا چوتھا سبب:

اختلاف ائمہ کا چوتھا سبب فن حدیث میں ان کی وسعت نظر اور ذخیرہ روایات کا تفاوت ہے، کسی بڑے سے بڑے امام یا محدث کے بارے میں یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے پورے ذخیرہ احادیث کا مکمل احاطہ کرلیا تھا اور کوئی حدیث اس کے دائرہ مرویات سے باہر نہیں تھی، سیدنا الامام الشافعیؒ الرسالۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

''لا نعلم رجلا جمع السنن فلم يذهب منها عليه شئ، فإذا جمع علم عامة أهل العلم بها أتى على السنن، وإذا فرق علم كل واحد منهم: ذهب عليه الشيئ منها، ثم كان ماذهب عليه منها موجودا عند غيره وهم في العلم طبقات: منهم الجامع لأكثره وإن ذهب عليه بعضه ومنهم الجامع لأقل مما جمع غيره'' (الرسالۃ الامام الشافعی ۴۲-۴۳ شرح وتحقیق احمد محمد شاکر)۔

(ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جس نے تمام احادیث کو اس طرح جمع کرلیا ہو کہ کوئی حدیث اس کے دائرہ علم سے باہر نہ ہو، جب حدیث کے جاننے والوں کا علم جمع کیا جائے گا تو تمام حدیثیں اس مجموعہ میں آجائیں گی، اور جب ہر ایک کا علم الگ کردیا جائے گا تو ہر ایک کے ذخیرہ میں کچھ نہ کچھ حدیثوں کی کمی رہ جائیگی، پھر جو حدیثیں ایک محدث کے ذخیرۂ روایات میں نہیں وہ (اسی طبقہ کے) کسی دوسرے محدث کے یہاں ضرور مل جائیں گی، محدثین اپنے علم کے اعتبار سے کئی طبقات پر ہیں، کچھ وہ ہیں جو اکثر احادیث کے جامع ہیں، کچھ ہی حدیثیں ان کے دائرہ علم سے باہر ہیں، کچھ وہ ہیں جن کا ذخیرۂ روایات پہلے سے کم ہے)

غرض یہ کہ کسی بڑے سے بڑے امام کے بارے میں یہ دعوی کرنا کہ انہیں ہر ہر حدیث کی اطلاع تھی اور

تمام احادیث صحیحہ صحیح سندوں کے ساتھ ان تک پہونچ گئی تھیں بالکل خلاف واقعہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ائمہ متبوعین پر قلت حدیث کا الزام عائد کیا جائے اور جہاں بھی ہم کوئی حدیث ایسی دیکھیں جس کے خلاف کسی امام کا مسلک ہو تو تحقیق کی زحمت کئے بغیر یہ فیصلہ صادر کریں کہ اس امام کو اس حدیث کا علم نہیں تھا، واقعہ یہ ہے کہ ائمہ متبوعین کی ذخیرہ حدیث پر بڑی وسیع و عمیق نظر تھی، خصوصاً احادیث احکام پر اور ان حضرات نے تقریباً احادیث احکام کے پورے ذخیرہ کو اپنے سینوں میں محفوظ کرنے اور اجتہاد و استنباط میں اس سے کام لینے کی انتہائی کامیاب کوشش کی، امام ابوحنیفہؒ جن کے بارے میں قلت حدیث کا الزام بار بار دہرایا جاتا ہے ان کے حالات میں شیخ عبدالقادر قرشی نے لکھا ہے:

"عن محمد بن سماعة أن أباحنيفة رحمه الله ذكر في تصانيفه نيفا وسبعين ألف حديث"

(الجواہر المضیۃ للشیخ عبدالقادر القرشی ۲/ ۴۷۴)۔

محمد بن سماعہ سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی تصانیف میں ستر ہزار سے زائد احادیث ذکر کی ہیں۔

علامہ صالحی شافعیؒ نے ''عقود الجمان'' میں ابن حجر مکیؒ نے ''الخیرات الحسان'' میں زرنجری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کے تلمیذ امام ابوحفص کبیر کے حکم سے امام ابوحنیفہؒ کے مشائخ کا شمار کیا گیا تو چار ہزار تابعین تک ان کی تعداد پہونچی، صالحی نے کتاب کے ۳۲ صفحات میں (۴۶/ ۷۸) امام صاحب کے بعض مشائخ کا نام لکھا ہے (عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان لمحمد بن یوسف الصالحی الدمشقی ۶۴/ ۷۸)۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ائمہ متبوعین کے لئے احادیث کا جمع کرنا اور اسے پرکھنا بعد والوں کے مقابلہ میں زیادہ آسان تھا، کیوں کہ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان واسطے بہت کم تھے مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ تابعین تھے اس لئے ان کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ ابی وامی) کے درمیان صرف دو یا تین واسطے پڑتے ہیں، صحابہ کرام تو سب عدول ہی ہیں، تابعین میں بھی خیر ہی غالب تھا، تابعین میں ایسے راوی بہت کم ملیں گے جن پر کذب وغیرہ کی جرح ہو، تابعین کے بارے میں جرحیں عموماً سوء حفظ یا اختلاط وغیرہ کی ہوتی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ وغیرہ کے لئے احادیث کا یاد کرنا اور اسے پرکھنا زیادہ آسان تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بڑی پتہ کی بات لکھی ہے:

"بل الذين كانوا قبل جمع هذه الدواوين كانوا أعلم بالسنة من المتأخرين بكثير لأن كثيرا مما بلغهم وصح عندهم، قد لا يبلغنا إلا عن مجهول، أو بإسناد منقطع أو لا يبلغنا بالكلية فكانت دواوينهم صدورهم التي تحوي أضعاف ما في الدواوين، وهذا أمر لا يشك فيه من علم القضية" (رفع الملام عن الائمۃ الاعلام، ص: ۲۴-۲۵)۔

(بلکہ جولوگ کتب حدیث کی تدوین سے قبل تھے وہ متاخرین کے مقابلے میں حدیث سے بہت زیادہ باخبر تھے کیوں کہ بہت سی وہ حدیثیں جو ان تک صحیح سند کے ساتھ پہونچیں ہم تک کسی مجہول راوی کے واسطہ سے پہنچتی ہیں یا منقطع سند کے ساتھ پہونچتی ہیں یا سرے سے پہنچتی ہی نہیں ہیں، ان کی کتابیں ان کے وہی سینے تھے جو کتب حدیث کی روایات کے مقابلے میں کئی گنا روایات محفوظ کئے ہوئے تھے، یہ ایسا معاملہ ہے جس میں کوئی باخبر آدمی شک نہیں کرسکتا)۔

پھر بھی ایسی مثالیں ملیں گی کہ امام کو ایک مسئلہ میں حدیث نہیں پہونچی اور انہوں نے قیاس سے حکم شرعی کا استنباط کیا، جب ان تک وہ حدیث پہنچی تو انہوں نے رجوع کرلیا اور حدیث کے مطابق فتوی دیا، یا امام کو آخر زندگی تک وہ حدیث نہیں پہونچی تو ان کے تلامذہ اور مدونین مذہب نے امام کے قول کو ترک کر کے حدیث کو اختیار کیا، فقہ حنفی میں اس کی متعدد مثالیں ملیں گی، مثلاً امام صاحب کا مسلک تھا کہ وقف صرف دوصورتوں میں لازم ہوجاتا ہے (۱) وصیت کے طور پر وقف کیا ہو (۲) قاضی نے لزوم وقف کا فیصلہ کردیا ہو، عام حالات میں امام صاحب کے نزدیک وقف لازم نہیں ہوتا بلکہ واقف اس سے رجوع کرسکتا ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی اس قول پر تھے لیکن امام صاحب کی وفات کے بعد امام ابو یوسف بغداد تشریف لائے وقف کے لازم ہونے کے بارے میں ان کے سامنے ایک حدیث پیش کی گئی تو انہوں نے فوراً رجوع کرلیا اور فرمایا:

”هذا مما لا يسع خلافه ولو تناهى هذا إلى أبي حنيفة لقال به ولما خالفه“ (النکت الطریفۃ، ص: ۴۰۔۴۱، للکوثری الطبعۃ الاولی ۱۳۶۵ھ)۔

(یہ ایسی (صحیح وصریح) حدیث ہے جس کے خلاف جانا ممکن نہیں، اگر یہ روایت امام ابوحنیفہ تک پہنچتی تو وہ بھی اسی کو اختیار کرلیتے اور اس کے خلاف نہ جاتے۔)

اس مسئلہ میں صاحبین ہی کے قول پر فتوی ہے، حدیث نہ پہنچنے کی وجہ سے بعض مسائل میں جو غلطی ائمہ کرام سے ہوئی ان کی شاگردوں اور اس مسلک کے فقہاء محدثین نے ان پر استدراک کیا اور اس کی تلافی کی۔

حاصل بحث:

حاصل بحث یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اختلافات دین کے غیر اساسی حصہ میں ہیں، یہ اختلافات امت میں فرقہ بندی کا باعث نہیں بلکہ امت کے لئے سراسر رحمت ہیں، ان اختلافات کی بنا پر امت کو کشادگی اور سہولت حاصل ہوئی، سارے ائمہ مجتہدین حدیث نبوی کی حجیت پر متفق ہیں اور اسے کتاب اللہ کے بعد دوسرا ماخذ تشریع تسلیم کرتے ہیں، ان کے اختلافات پر فن حدیث کے غیر معمولی اثرات پڑے، احادیث کی تصحیح وتضعیف کے سلسلے میں ان کے اصولی اختلافات، فہم حدیث میں ان کا تفاوت، جرح وتعدیل کے سلسلے میں ان کے مختلف نقطہ ہائے نظر، ذخیرۂ

احادیث پر اطلاع کے سلسلے میں ان کا تفاوت یہ تمام امور ان اختلافات پر اثر انداز ہوئے۔ کسی امام کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ انھوں نے کسی حدیث کو صحیح اور قابل عمل سمجھنے کے باوجود اس کی مخالفت کی، جو لوگ ایسی بدگمانی کرتے ہیں وہ اپنی بے خبری یا بدنیتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

☆☆☆

وقف کی شرعی حیثیت اور اس کا استبدال

مولانا محمد ظفر عالم ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

شرع اسلامی میں وقف کا ایک مستقل نظام پایا جاتا ہے، اور اسلام کے دورِ اول سے اب تک اس کا تسلسل قائم ہے، مسلمانوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ یہ دنیا کے جس ملک میں بھی آباد ہوئے وہاں انھوں نے نیکی کے کاموں اور خیراتی مقاصد کے لیے اپنی جائیدادیں وقف کیں ہے، برصغیر ہندو پاک کے تمام خطوں میں آج بھی یہ نظر آتی ہیں، جن کو اس ملک کے باشعور اور دیانت دار مسلمانوں نے صدیوں سے باقی رکھا اور اس کی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی، الحمدللہ یہ جائیدادیں خواہ مساجد و مدارس کی شکل میں ہوں یا مقابر اور درگاہوں اور خانقاہوں کی صورتوں میں یا ان پر وقف شدہ جائیدادیں اور عمارتیں ہوں وہ آج بھی باقی اور جاری وساری ہیں، لیکن افسوس کہ عرصہ سے یہاں کی حکومتوں کی نظر میں یہ جائیدادیں کھٹکتی رہی ہیں، اور ان کو قومی سرمایہ قرار دے دینے کے منصوبے بنتے رہے اور اس کے لیے ملک کے پارلیمنٹ میں طرح طرح کے مسوّدے اور بل آتے رہے، موجودہ حکومت ان اوقاف کی حفاظت اور اصلاح کے نام پر جو ترمیمی بل ۲۰۲۴ء لے کر آئی ہے، اس میں ترمیمات کی جتنی بھی دفعات ہیں خدانخواستہ اگر یہ منظور ہوجائیں گی تو ہندوستان میں پھیلی ہوئی اوقاف کی جائیدادیں اپنے مقاصد سے ہٹ کر دوسرے مقاصد میں صرف ہونے کے قوی اندیشے پیدا ہوجائیں گے، اس کے لیے اوقافِ اسلامی کی میڈیا میں یا خود پارلیامنٹ میں وقف کی جو تشریح کی جارہی ہے وہ اس کی شرعی حیثیت کو مجروح کررہی ہے، اور مسلمانوں کا ایک طبقہ خواہ وہ روشن خیالوں کا ہو یا نا واقف حضرات کا وہ غلط فہمی کا شکار ہوتا جارہا ہے، اسی طرح اوقاف کے ذمہ داروں کی ایک تعداد ان جائیدادوں میں تبدیلی لانے اور واقفین کے منشاء کے برخلاف اپنی سوچ کے مطابق استعمال کی اسکیمیں سوچتی اور گاہے بگاہے اپنی سوچ کے مطابق عمل بھی کرتی ہے، جس کی وجہ سے منشاء واقف کے متأثر ہونے کے علاوہ جائیدادیں ضائع بھی ہوجاتی ہیں، اس پسِ منظر میں ہم ذیل میں مختصراً وقف کی شرعی حیثیت اور اس کے استبدال کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

فقہ اسلامی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ’’کسی قیمتی شے کی ذات (Corpus of Property) کو خدا کی ملک میں مقید کردینا اور اس کی منفعت کو دوسروں پر مذہبی و خیراتی اغراض کے تحت نیک نیتی کے ساتھ دائماً

صدقہ کردینے کا صاف اور صریح اظہار ''وقف'' کہلاتا ہے۔

وقف کرنے والے شخص کو ''واقف'' یا ''بانیٔ وقف'' کہا جاتا ہے، وقف جس فرد یا جماعت کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کیا جائے اس فرد یا جماعت کو ''موقوف علیہ'' یا ''موقوف علیہم'' کہا جاتا ہے اور جس تحریر کے ذریعہ سے وقف کا اظہار یا اعلان کیا جائے اس کو ''وقف نامہ'' کہا جاتا ہے۔

شرعی طور پر یہ ضروری ہے کہ جن اغراض ومقاصد کے لیے وقف کیا جائے وہ شرع اسلامی میں مذہبی یا خیراتی یا امور خیر میں شمار ہوتے ہیں، اسی طرح وقف درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دائمی ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی جائیداد وقتی یا عارضی مدت کے لیے وقف کی جائے تو وہ وقف نہیں کہلائے گی، کیوں کہ وقف کا مقصد دواماً حصول ثواب ہوتا ہے جو ایک دائمی وقف کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، فقہ اسلامی کے ماہرین نے حضرت عمرؓ کے اس قول ''لا یباع ولا یوھب ولا یورث'' سے استدلال کیا ہے یعنی وقف کی جائیداد نہ فروخت کی جائے گی اور نہ ہبہ اور نہ ہی ورثہ میں منتقل ہوگی، حضرت عمرؓ نے اپنی قیمتی جائیداد وقف کرتے وقت اس کی شرعی پوزیشن واضح کرتے ہوئے یہ جملہ وقف نامہ میں درج کیا تھا، آپؓ کے علاوہ صحابۂ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد نے اپنی جائیدادیں دینی امور اور کارِ خیر میں وقف کی ہیں جن کی تفصیلات اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔

غرض کہ شرعی نقطۂ نظر سے وقف کی جائیدادوں کو حسبِ سابق باقی رکھنا اور ان کی منفعت کو دائمی طور پر واقفین کے مقاصد کے مطابق صرف کرنا ضروری ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے ایک دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اوقاف کی مختلف انواع کے مقابلہ میں مساجد کو زیادہ تقدس اور احترام حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ مساجد کی فروختگی یا منتقلی کسی حال میں درست نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی مسجد ویران ہوجائے اور وہاں نماز ادا کرنے کا سلسلہ موقوف ہوجائے تب بھی وہ جگہ تا قیامت مسجد ہی رہتی ہے۔

وقف کی اس مختصر تشریح اور تمہیدی گفتگو کے بعد اب ہم اس کے استبدال کی طرف آتے ہیں، استبدال پر گفتگو کرنا اس لیے ضروری ہے کہ کبھی حالات کی تبدیلی اور بعض اوقاف کی جائیدادوں کی آمدنی میں کمی کی وجہ سے مقاصد کو بروئے کار لانے میں دشواری ہوتی ہے، اور کبھی اوقاف کو تبدیل کرنا ضروری ہوجاتا ہے، ان وجوہات کی وجہ سے متولیانِ کرام جائیدادِ اوقاف کو بدلنا چاہتے ہیں، اس مصلحت اور ضرورت کے پیشِ نظر استبدالِ وقف کی چند صورتوں کی وضاحت ذیل میں درج ہے:

استبدال وقف کیا ہے؟

وقف کردہ شیٔ کو فروخت کرکے اس کی جگہ دوسری شیٔ خریدنا یا شیٔ موقوف کا دوسری شیٔ سے تبادلہ کرنا استبدال کہلاتا ہے، استبدال میں واقف کی شرائط اور وقف کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، تبدیلیٔ وقف میں ان دو باتوں کا لحاظ

ضروری ہے کہ وقف کی تبدیلی میں خود واقف کی طرف سے کیا صراحت ہے اور پھر وقف کی تبدیلی سے اصل وقف پر کیا اثر پڑے گا؟

استبدال کی صورتیں:

۱۔ استبدال کی پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقت وقف نامہ میں یہ صراحت کر دی ہے کہ اگر وقف کی آمدنی سے مصارف پورے نہ ہوں اور اس کی تبدیلی سے آمدنی بڑھ جائے اور بآسانی مصارف پورے ہوں تو متولی کو استبدال کی اجازت ہوگی۔

۲۔ متبادل اوقاف قائم کرنا:

دوسری صورت یہ ہے کہ اوقاف کی وہ جائدادیں جہاں سے مسلم آبادی ختم ہوگئی اور مسلمان دوسری جگہ منتقل ہوگئے، جس کی وجہ سے یہ جائیدادیں کارآمد نہیں رہیں یا وہ مکانات اور دوکانیں جن کی آمدنی مساجد، مدارس یا خانقاہوں پر وقف تھی، وہ ویران ہونے کی وجہ سے غیر نفع بخش ہوگئیں، اس صورتِ حال کی وجہ سے متولیان ان کو فروخت کر کے متبادل اوقاف مسلم آبادی میں قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس بارے میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے ایسے غیر نفع بخش اور ویران اوقاف کو جو مساجد کے علاوہ ہوں فروخت کر کے منشاء واقف کی رعایت کرتے ہوئے ان کی جگہ متبادل اوقاف مسلم آبادی میں قائم کرنا درست ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ نے استبدال وقف کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وقف کی آمدنی بالکلیہ غیر نفع بخش ہوجائے یا اس آمدنی سے مصارف وقف پورے نہیں ہورہے ہوں تو مفتی بہ قول یہ ہے کہ قاضی کی اجازت سے ان اوقاف کی جگہ متبادل اوقاف قائم کرنا درست ہے، موصوف کے الفاظ درج ذیل ہیں:

”والثاني أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شيئ أصلاً أو لا يفيئ بمؤنته فهو أيضاً جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه۔“ (رد المحتار على الدر المختار، ج:۴، ص:۳۸۴)

دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی کوئی شرط نہ لگائی ہو خواہ عدم شرط ہو یا سکوت، لیکن وقف کی جائیداد کی حیثیت ایسی ہوگئی کہ اس سے کلی طور پر انتفاع حاصل نہ ہو یا اصلاً اس سے کچھ حاصل نہ ہو یا اتنی ہو جس سے مصارف پورے نہ ہوں تو ایسی صورت میں قاضی کی اجازت سے استبدال جائز ہے، جب کہ قاضی کی رائے میں وقف کا فائدہ ہو۔

اس مسئلہ میں علامہ ابن ہمام نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور استبدال کی شرائط اس کے جواز اور عدم جواز کے پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے، اور فقہاء کی آراء بالخصوص قاضی خاں کے فتاوے کو بھی پیش کیا ہے، اور یہ نقطۂ نظر بیان کیا ہے کہ استبدال کی شرطوں کی رعایت اور واقف کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنانے کی خاطر متبادل اوقاف قائم

کرنا وقف کو باطل کرنا نہیں بلکہ بہتر صورت اختیار کرنا ہے، علامہ موصوف نے امام ابو یوسفؒ، امام ہلالؒ اور امام خصافؒ کی آراء کو بھی پیش کیا ہے، اور اس عبارت "**لو شرط أن یستبدل بھا أرضاً أخری تکون وقفاً مکانہ فھو جائز عند أبي یوسف وھلال والخصاف وھو استحسان۔**" کے تحت موضوع کا علمی اور تحقیقی جائزہ بھی پیش فرمایا ہے۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ، ج:٦، ص:٢١١)

اس موضوع پر فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام بمقام بمبئی اکتوبر ۱۹۹۷ء میں ایک سیمینار ہوا تھا، فقہ و فتاویٰ کے ماہرین کے درمیان بحث و تحقیق کے بعد کچھ تجاویز منظور ہوئیں، جن میں ایک تجویز یہ بھی ہے:

مساجد کے علاوہ دوسرے وہ اوقاف جو ان مقامات میں واقع ہیں جہاں پر دور دور تک مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے ان اوقاف کو آباد کرنا اور واقف کے مقاصد کے مطابق انھیں بروئے کار لانا ناقابل عمل ہو گیا ہے، اور ان اوقاف پر قبضۂ غاصبانہ کا پورا خطرہ ہے ایسے اوقاف کو فروخت کر کے دوسرے مقامات پر اسی نوع کے اوقاف قائم کرنا درج ذیل شرطوں کے ساتھ درست ہے:

الف: اس بات کی تحقیق کر لی گئی ہو کہ مسلمانوں کی آبادی ان مقامات سے کلیۃً ختم ہو چکی ہے اور مستقبل قریب میں وہاں مسلمانوں کے آباد ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

ب: وقف جائداد کی فروختگی مناسب قیمت پر مارکیٹ ویلو کا لحاظ کرتے ہوئے کی جائے، اتنی کم قیمت پر اسے فروخت نہ کی جائے جتنی کم قیمت قیمتوں کے ماہرین نہیں لگا سکتے۔

ج: وقف کو فروخت کرنے والے متولی یا وقف افسر اس کی فروختگی اپنے کسی قریبی رشتہ دار یا کسی ایسے شخص کے ہاتھ نہ کرے جس سے اس کا مفاد وابستہ ہو، اسی طرح کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروختگی نہ کرے جس کا قرض یا مالی دین فروخت کرنے والے کے ذمہ لازم ہے۔

د: وقف جائیداد کی فروختگی روپے، پیسے کے بجائے جائیداد سے کی جائے اور اگر کسی قانونی یا عملی دشواری کی وجہ سے نقد روپیوں سے فروختگی کی جائے تو جلد سے جلد اس کے ذریعہ جائیداد خرید کر متبادل وقف قائم کر دیا جائے۔

ھ: وقف کے تبادلہ اور فروختگی کی اجازت شرائط استبدال کی تحقیق کر کے شرعی قاضی یا اوقاف کی شرعی کمیٹی دے جس میں مسائل اوقاف سے واقف متقی وخداترس علماء اور مسلمان متدین ماہرین قانون ضرور شامل ہوں، موقوفہ جائیداد کی فروختگی اور تبادلہ کے لیے وقف بورڈ یا وقف آفیسر کی اجازت شرعاً کافی نہیں ہے، اس سلسلہ میں وقف ٹریبونل کی اجازت شرعاً اس وقت معتبر ہوگی جب اس میں کم سے کم تین مستند مفتیانِ کرام کی رائے لینے اور مشورہ طلب کرنے کے بعد ان کے مشورے کے مطابق فیصلہ کیا ہو۔ (منقول از تجاویز بابت اوقاف بمقام بمبئی ۱۹۹۷ء)

مساجد اور دوسرے اوقاف میں فرق:

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مساجد کا معاملہ دیگر اوقاف کے مقابلہ میں جداگانہ ہے، مساجد کے بارے میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مساجد کا استبدال یا منتقلی کسی طرح بھی جائز نہیں ہے خواہ وہاں سے آبادی منتقل ہونے یا ختم ہوجانے کی بنا پر ویران کیوں نہ ہوگئی ہو، ویران یا غیر مفید ہونے کی صورت میں عام اوقاف کا استبدال تو درست ہے لیکن مساجد کا استبدال اور منتقلی جمہور فقہاء کی صراحت کے مطابق ہرگز جائز نہیں، علامہ حصکفی الدرالمختار میں لکھتے ہیں:

”ولو خرب ماحوله واستغنیٰ عنه یبقی مسجدا عندالإمام والثانی أبداً إلی قیام الساعة وبه یفتیٰ۔“(الدرالمختار ۴/ ۳۵۸)

اگر مسجد کے اردگرد کی آبادی ویران ہوجائے اور لوگ دوسری جگہ منتقل ہونے کی وجہ سے مسجد سے مستغنی ہوگئے ہوں تب بھی وہ قیامت تک ہمیشہ کے لیے مسجد رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے:

”وکذا لو خرب ما حوله ولیس له ماتعمر به وقد استغنیٰ الناس عنه لبناء مسجد آخر ...... فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله إلی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وأکثر المشائخ علیه وهو الأوجه۔“(ردالمحتار علی الدر المختار، ج:۶،ص:۵۴۸)

اگر مسجد کے اردگرد کی آبادی ویران ہوجائے اس کے آباد کرنے کی کوئی صورت نہ ہو اور لوگ دوسری مسجد کی تعمیر کی وجہ سے اس سے مستغنی ہوگئے ہوں تو اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام یوسفؒ کے نزدیک وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، نہ میراث میں لوٹے گی نہ ہی اس کو منتقل کرنا جائز ہوگا اور نہ ہی اس کا مال و میٹریل دوسری مسجد میں منتقل کرنا درست ہوگا، خواہ لوگ اس میں نماز ادا کرتے ہوں یا نہیں، اکثر مشائخ کی یہی رائے ہے اور یہی قابل ترجیح ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے مسجد کی حیثیت متعین کرتے ہوئے امام ابو یوسفؒ کا قوم عدم استبدال کا نقل کیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

”وقال أبو یوسف هو مسجداً أبداً إلی قیام الساعة لا یعود میراثاً ولا یجوز نقلهٗ ونقل ماله إلی مسجد آخر، سواء کانوا یصلّون فیه أولا وهو الأوجه۔“(البحر الرائق ۵/۲۵۱)

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وہ جگہ ہمیشہ کے لیے تا قیامت مسجد رہے گی، نہ وہ میراث میں لوٹے گی اور نہ اس کی اور اس کے سامان کی منتقلی دوسری مسجد کی طرف ہوگی، خواہ لوگ اس میں نماز پڑھتے ہوں یا نہیں اور یہی قول راجح ہے۔

فتاویٰ ہندیہ، اسی طرح قاضی خاں اور فتح القدیر شرح ہدایہ میں بہت سی جزئیات موجود ہیں، جن سے واضح طور

پر معلوم ہوتا ہے کہ مشکل حالات اور بوقت ضرورت بھی مسجد کا استبدال اور اس کی منتقلی جائز نہیں ہے۔

مسجد پر وقف کردہ اراضی کا استبدال:

البتہ جو جائیدادیں مسجد کی آمدنی کے لیے ہیں، ان کا حکم الگ ہے، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے:

"الوقف علی المسجد لیس کالمسجد في حرمة البیع و الاستبدال مطلقاً۔"

مسجد پر وقف جائیداد کا حکم بیع کی حرمت اور استبدال میں مسجد کی طرح نہیں ہے۔

آگے علامہ موصوفؒ نے ظہیریہ کے حوالہ سے ایک فتویٰ نقل کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے اوقاف کا حکم مساجد سے جدا ہے:

"سئل عن الحلواني عن أوقاف المساجد اذا تعطلت و تعذر استغلالها هل للمتولی أن يبيعها ويشتري بثمنها أخریٰ قال: نعم!" (اعلاء السنن، ج:۱۳، ص:۱۹۶)

امام حلوانیؒ سے مساجد کے ان اوقاف کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ناکارہ ہوگئے ہوں اور ان سے آمدنی حاصل کرنا دشوار ہوگیا ہے تو کیا متولی کے لیے یہ جائز ہے کہ ان کو فروخت کردے اور ان کی قیمت سے دوسری جائیداد خرید لے۔ فرمایا: ہاں!

مساجد کی اراضی اور زائد آمدنی سے تعلیمی اور رفاہی اداروں کا قیام:

مسجد پر وقف اراضی کا استبدال مسجد کی ضرورت کے پیش نظر تو درست ہے لیکن اس کی اراضی یا زائد آمدنی سے تعلیمی ورفاہی اداروں کا قیام درست نہیں ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"لا يجوز صرف وقف المسجد خرب إلی حوض و عكسه و في شرح الملتقیٰ يصرف وقفها لأقرب مجانس لها۔" (ردالمحتار، ۴/ ۳۵۹)

غیر آباد مسجد کے وقف کی آمدنی کو حوض میں یا حوض کی آمدنی مسجد میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اور شرح الملتقی میں ہے کہ اوقاف کی آمدنی اسی جنس کے وقف میں صرف کی جائے گی جب کہ آمدنی اصل وقف کے اخراجات سے زائد ہو۔

علامہ ابن ہمامؒ نے مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے:

"وهكذا نقل عن شيخ الإسلام الحلواني في المسجد و الحوض إذا خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس عنه، أنه يصرف أوقاف إلی مسجد آخر أو حوض آخر۔" (فتح القدير شرح الهداية ۶/ ۲۳۷)

شیخ الاسلام حلوانیؒ سے منقول ہے اس مسجد اور حوض کے بارے میں جو ویران ہوجائے اور وہاں سے لوگوں کے منتقل ہوجانے کی وجہ سے تو اس کے اوقاف کی آمدنی دوسری مسجد یا حوض کی آمدنی دوسرے حوض میں صرف کی

جائے گی۔

البتہ مساجد کی زائد آمدنی دوسری مساجد پر صرف ہوگی اور اس کی آراضی پر بطور کرایہ داری تعلیمی ورفاہی ادارہ قائم کیے جائیں گے اور آمدنی مساجد کو ملے گی، ادارے بغرض تحفظ بنیں گے، ملکیت مسجد کی ہوگی اور ادارہ کرایہ دار ہوگا اور آمدنی مسجد کو ملے گی، اس بارے میں فقہ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ بھی یہی ہے جو آگے آرہا ہے۔

ناقابل استعمال اوقاف میں تعلیمی اور رفاہی اداروں کا قیام:

ہمارے ملک ہندوستان میں مساجد کے علاوہ اوقاف کی بہت سی ایسی جائیدادیں ہیں، جن کا اپنے مقاصد میں استعمال کرنا مشکل ہوگیا ہے، اور استعمال نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اس پر قبضہ کرتے جارہے ہیں، اس لیے ملت کے بعض بہی خواہ حضرات یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیوں نہ ان اوقاف کو تعلیمی اور رفاہی کاموں میں استعمال کیا جائے یعنی مدرسے، عصری تعلیمی ادارے، یتیم خانے اور مسافر خانے وغیرہ بنادیئے جائیں تاکہ ان کا تحفظ ہوسکے اور خیر کے کاموں میں استعمال ہوسکیں، اس سلسلہ میں فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار میں ایک تجویز منظور ہوئی ہے، جو ذیل میں درج ہے:

(۹) مسجد پر وقف زائد اراضی جن کی نہ مسجد کو فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت پیش آنے کی امید ہے، ان اراضی پر دینی تعلیم کا مدرسہ یا مکتب قائم کرنا درج ذیل صورتوں میں درست ہوگا۔

(الف) مسجد آباد نہ ہو اور مدرسہ یا مکتب قائم ہونے میں مسجد کے آباد ہونے کی امید ہو۔

(ب) مسجد پر موقوف زائد اراضی پر قبضۂ غاصبانہ کا شدید خطرہ ہے اور دینی مدرسہ یا مکتب قائم ہونے کی وجہ سے خطرہ ٹل جائے گا۔

(ج) جس آبادی یا محلہ میں مسجد واقع ہے وہاں مسلمان بچوں کے لیے کوئی دینی مدرسہ یا مکتب قائم کرنے کے لیے کوئی مستقل بندوبست بھی نہ ہو تو مسجد پر وقف زائد اراضی میں دینی مدرسہ یا مکتب قائم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لیے مسجد کے متولی یا منتظم کمیٹی سے اجازت لے لی جائے، بہتر یہ ہے کہ خود مسجد کی کمیٹی ہی اس مکتب یا مدرسہ کا بندوبست کرے۔ (ماخوذ از تجاویز وقف، دسواں فقہی سمینار بمبئی، بتاریخ ۷ تا ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء، نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۴۸)

جہاں تک رفاہی ادارے یا عصری تعلیمی ادارے کی قیام کی بات ہے تو اس بارے میں اربابِ فقہ وفتاویٰ کی رائے یہ ہے کہ ان کاموں کے لیے مساجد پر وقف اراضی بطورِ کرایہ دی جاسکتی ہیں چنانچہ فقہ اکیڈمی انڈیا کی ایک دوسری تجویز اس بارے میں یہ ہے:

(۱۰) مساجد پر وقف اراضی جن کا مقصد مساجد کے لیے آمدنی فراہم کرنا ہے، ان کو مناسب کرایہ پر

مسلمانوں کی دینی، عصری یا ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے لیے دیا جاسکتا ہے، لیکن معاملات اس طرح طے کیے جائیں کہ مساجد کی مالکانہ حیثیت مجروح نہ ہو۔ (ماخوذ از تجاویز وقف، نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۵۲)

کم نفع بخش وقف کا استبدال:

اوقاف کی بعض جائیدادوں سے آمدنی کم ہوجاتی ہے جس سے مصارف کی تکمیل میں دشواریاں ہوتی ہیں مثلاً بعض جائیدادیں دیہات میں ہوتی ہیں جن میں کھیتی ہوتی ہے، فی زماننا اخراجات زیادہ اور اس کی نسبت سے آمدنی کم ہوتی ہے، اگر ان جائیدادوں کو فروخت کرکے اس رقم سے قصبات یا شہروں میں جگہ لے لی جائے اور عمارتیں تعمیر کردی جائیں، خواہ دکانوں کی شکل میں ہو یا رہائشی کرایہ داری مکانات کی شکل میں ہوں۔ اور وہ کرایہ پر اٹھادی جائیں، تو کیا اس صورت میں وقف جائیدادوں کا استبدال درست ہوگا؟ اس بارے میں فقہاء کی آراء دونوں طرح کی ملتی ہیں، جواز کی بھی اور عدم جواز کی بھی، علامہ ابن ہمامؒ نے عدم جواز کے پہلو کو ترجیح دی ہے اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''فتح القدیر'' میں صراحت کرتے ہیں:

''ينبغي أن لا يجوز'' (أي استبدال في حال وجود غلة) لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة أخرى۔'' (فتح القدیر ج ۶ ص: ۲۱۳، کتاب الوقف، مکتبہ زکریا)

علامہ موصوف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وقف نفع بخش ہے خواہ کم ہی ہو تو اس کا استبدال مناسب نہیں کیوں کہ اصلاً وقف کو اپنی اصلی حالت پر باقی رکھنا ہے نہ کہ زیادہ آمدنی حاصل کرنا ہے، اس مسئلہ میں علامہ ابن عابدینؒ نے بھی گفتگو کی ہے اور ایک فرق کی وضاحت کی ہے کہ زمین کا استبدال تو جائز ہے لیکن مکان کا استبدال کسی طرح جائز نہیں ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''إن الخلاف في الثالث إنما هو في الأرض إذا ضعفت عن الاستغلال بخلاف الدار إذا ضعفت بخراب بعضها ولم تذهب أصلاً فإنه لا يجوز حينئذ الاستبدال على كل الأقوال۔'' (رد المحتار على الدر المختار، ج ۶، ص: ۵۸۹، طبع دار الكتب العلمية، بيروت)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ استبدال وقف کی تیسری صورت جس میں فی نفسہ آمدنی تو آتی ہو لیکن کم آتی ہو، اگر زائد آمدنی کے لیے اس کو بدل کر دوسرا متبادل وقف قائم کیا جائے تو اس بارے میں زمین سے متعلق اختلاف تو ہے لیکن اگر وقفی جائداد مکان ہو اور بعض حصے خراب ہونے کی وجہ سے آمدنی کم ہو تو اس صورت میں تمام فقہاء کی آراء میں استبدال جائز نہیں ہے، علامہ موصوف آگے مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولا يمكن قياسها على الأرض فإنّ الأرض إذا ضعفت لا يرغب غالباً في استيجارها بل في

شرائها، أما الدار فيرغب في استيجارها هامدة طويلة لأجل تعميرها للسكن۔"(رد المحتار على الدر المختار، ج ٦، ص: ٥٨٩، طبع دار الكتب العلمية، بيروت)

علامہ موصوف نے اس وضاحت میں زمین اور مکان کے درمیان جو فرق کیا ہے اور جس بنیادی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مکان کا استبدال اس لیے درست نہیں ہے کہ مکان قابلِ رہائش ہونے کی وجہ سے خواہ جہاں بھی ہو لوگ کرایہ پر لینے میں رغبت رکھتے ہیں، لیکن زمین کرایہ پر لینے میں بسا اوقات دلچسپی نہیں رکھتے، اس طرح آمدنی کم سے کم ہوسکتی ہے۔

ناچیز کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں مکان کرایہ پر لینے کا رجحان دیہات میں نہیں ہوتا ہے بلکہ ایسا شہر میں ہوا کرتا ہے، دیکھا جائے تو ہمارے دور میں دیہات میں رہائش کے لیے مکان کرایہ پر لینے کا کوئی رواج ہی نہیں ہے، لیکن کاشت کی زمین کرایہ پر لی جاتی ہے اور دن بدن اس میں رغبت بڑھ رہی ہے، اگر اس بنیاد کو فی زمانناسامنے رکھیں تو مکان کے استبدال میں جواز ہی کا پہلو نکلتا ہے اس لیے ناچیز کے خیال میں کم نفع بخش مکان جو دیہات میں ہے اُسے فروخت کرکے شہر میں زیادہ نفع بخش مکان" دستیاب ہوسکے تو اس کے خرید لینے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے، اور یہ انفع للوقف بھی ہے اور مقاصد وقف کے منافی بھی نہیں، ذخیرہ میں صراحت ہے:

"روي عن أبي يوسف أنه قال: لا بأس باستبدال الوقف لما روي عن علي بن أبي طالب أنه وقف على الحسن والحسين رضي الله عنه، فلما خرجا إلى صفين قال: إن فأت بهم الدار فبيعوها وأقسموا ثمنها بينهم، ولم يكن شرط البيع في أصل الوقف۔" (الذخيرة بحوالة محاضرات في الوقف لأبي زهرة ص: ١٦٤)

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے انھوں نے کہا ہے کہ وقف کے استبدال میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت حسن اور حسینؓ پر مکان وقف کیا، جب آپؓ صفین چلے گئے، تو فرمایا کہ اگر مکان دور معلوم ہو رہا ہو تو اسے فروخت کردو اور اس کی قیمت آپس میں تقسیم کرلو حالاں کہ اصل وقف میں بیع کی شرط نہیں لگائی گئی تھی۔

ماضی قریب کے مشہور فقیہ امام ابوزہرہ نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ فتویٰ قدیم زمانہ ہی سے اس صورت میں بھی استبدال کے جواز ہی کا رہا ہے، آپ کی بات ان الفاظ میں درج ہے:

"والفتوى من قديم الزمان على جواز الاستبدال في هذه الحال كسابقتها وعليه العمل في المحاكم العربية، إن استثنينا البلاد السعودية فإن العمل فيها على مقتضى المذهب الحنبلي، وإن الاستبدال فيه مصلحة ظاهرة۔" (محاضرات في الوقف لأبي زهرة، ص: ١٦٥)

موصوف کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ اگر ہم بلادِ سعودیہ جہاں پر فقہ حنبلی کے مطابق عمل ہوتا ہے مستثنیٰ کردیں، تو ہمیں عہد قدیم ہی سے مذکورہ صورتِ حال میں وقف کے استبدال کے جواز کا فتویٰ ملتا ہے جیسا کہ سابق میں رہا ہے، اور تمام عرب عدالتوں میں اسی پر عمل ہے، اور دیکھا جائے اس صورتِ حال میں استبدال ہی میں مصلحت اور مفاد معلوم ہوتا ہے۔

مذکورہ تمام تر گفتگو کا حاصل ناچیز کے نزدیک یہ نکلتا ہے کہ فی زمانا وہ مکان یا دکان جو کم نفع بخش ہوا سے فروخت کرکے زیادہ نفع بخش مکان خریدنا درست ہے اور وقف کے مصالح کے موافق ہے، البتہ اس اہم تبدیلی میں دیانت دار اور احکام شرع سے واقف متولیوں کا ہونا ضروری ہے اور قاضی شرعی کی رائے لینا ازبس ضروری ہے۔

کیا قدیم اور غیر مستعمل قبرستان کا استبدال جائز ہے؟

ہمارے ملک کے بعض حصّوں میں ایسے بھی قبرستان ہیں جو استعمال میں نہیں ہیں اور ویران پڑے ہوئے ہیں، خواہ اس کی جو بھی وجہ ہو، مسلم آبادی وہاں سے خواہ فسادات کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئی ہو یا کسی وبا کے پھیلنے سے آبادی ہی ختم ہوگئی ہو، تاہم قبرستان جوں کے توں پڑے ہیں، جن کے تحفظ کا کوئی سامان بھی نہیں ہے، نہ ہی وہاں مسلمانوں کی آمدورفت ہے، کیا ایسا کیا جاسکتا ہے کہ قبرستان کی اس قسم کی اراضی فروخت کرکے دوسری جگہ جہاں مسلمان آباد ہوں اور ان کو قبرستان کی ضرورت بھی ہو، اراضی خرید کر قبرستان بنائے جاسکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں استبدال وقف سے متعلق فقہاء نے جو کلام کیا ہے ان میں دو باتیں پیشِ نظر ہیں: ایک یہ کہ وقف شدہ جائیداد بعینہ محفوظ ہو، دوسری بات یہ کہ یہ جائیدادیں واقف کی منشاء کے مطابق استعمال ہوں، مذکورہ صورتِ حال میں دونوں چیزیں موجود نظر آتی ہیں، اور اس کے استبدال ہی میں وقف کا مفاد نظر آرہا ہے، اس لیے اس کے استبدال میں کوئی حرج نہیں، بلکہ معطل وقف کو بروئے کار لانا ہے، جو وقف کے حق میں بہتر ہے۔

واللّٰہ أعلم بالصواب، وما توفيقي إلا بالله۔

فسخ نکاح کے چند اسباب اور کچھ جدید شکلیں

مولانا رحمت اللہ ندوی
(استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نکاح انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ اور زندگی کو خوش گوار اور پرسکون بنانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اسی لئے اسلام نے نکاح کرنے پر زور دیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے، اور تجرد وتنہائی کی زندگی گزارنے سے منع کیا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ "جو قدرت کے باوجود نکاح سے بے رغبتی اختیار کرے وہ ہم سے نہیں ہے، اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" کیوں کہ تجرد اور تنہائی کی زندگی کے دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے کئی مفاسد ہیں۔

نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں تاحیات نباہ کرنے کا عہد و پیمان ہوتا ہے، بلا کسی معقول وجہ یا کسی معمولی وجہ اور بات پر اس رشتہ کو توڑ دینا، نہ ہی مناسب ہے اور نہ ہی اس کی اجازت اور گنجائش ہے، لیکن چونکہ ہر انسان کی زندگی میں مختلف موڑ آتے ہیں اور وہ سرد وگرم حالات کا شکار ہوتا ہے اور نہ معلوم کیسے کیسے مراحل سے گزرتا ہے؟ اسی لیے اسلام نے یہ آپشن بھی رکھا ہے کہ زوجین کے لئے ایسا وقت آجائے کہ ایک ساتھ گزارہ ممکن نہ ہو تو وہ ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کرلیں۔

اس علاحدگی کی ایک صورت طلاق ہے جس میں شوہر خود مختار ہوتا ہے، دوسری صورت خلع کی ہے، یہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہوتا ہے اور بیوی اس کے لئے کچھ معاوضہ دے کر شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ کرتی ہے، ایک تیسری شکل فسخ وتفریق ہے، جو بیوی کے مطالبہ پر قاضی شریعت اس وقت انجام دیتا ہے جب کہ شوہر بیوی کا حق زوجیت ادا نہ کرتا ہو، یا اس پر ظلم وزیادتی کرتا ہو، یا جنسی تعلق میں کمزور یا ناکام ہو، یا شوہر کسی ایسی بیماری یا عیب میں مبتلا ہو جس کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل اور باعث اذیت ہو۔

شریعت نے طلاق، خلع اور فسخ کے جو طریقے بتائے ہیں، وہ ساری شکلیں مشکل حالات اور مجبوری کی صورت میں اختیار کی جائیں گی۔ طلاق یا خلع واقع ہونے کے لئے شرعاً شوہر کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن بعض مخصوص حالات میں قاضی شرعی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر بھی زوجین میں تفریق کرسکتا ہے، کیونکہ نکاح کے بعض حقوق ایسے ہوتے ہیں جو نکاح کے مصالح اور مقاصد میں سے ہیں اور قضاءً ان کی ادائیگی شوہر پر لازم ہوتی ہے، اگر شوہر ان کی ادائیگی نہ کرے تو بزور عدالت انہیں وصول کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بیوی کا نان ونفقہ اور حقوق زوجیت وغیرہ۔

اگر شوہر ان کی ادائیگی سے عاجز ہو اور اس کی وجہ سے بیوی علاحدگی کا مطالبہ کر رہی ہو تو عورت کو طلاق دے دے ،ایسی صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرتا ہے یا شوہر طلاق دینے کے قابل نہیں ہے تو قاضی اس کا قائم مقام بن کر میاں بیوی کے درمیان تفریق کر سکتا ہے، کیوں کہ اس کو ولایت حاصل ہوتی ہے، بیوی خود تفریق نہیں کر سکتی۔

وہ اسباب جن کی بنا پر قاضی شرعی میاں بیوی کا نکاح فسخ کر سکتا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) شوہر پاگل یا مجنون ہے۔ (۲) شوہر نان و نفقہ ادا نہ کرتا ہو۔ (۳) شوہر نامرد ہو۔ (۴) شوہر مفقود الخبر یعنی لاپتہ ہو۔ (۵) شوہر غائب غیر مفقود ہو، اور عورت کے لیے خرچ وغیرہ کی کفالت کا انتظام نہ ہو یا عورت کے معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ (۶) شوہر بیوی کو سخت مار پیٹ کرتا ہو۔

مذکورہ بالا اسباب میں سے کسی بھی سبب کی موجودگی میں اگر عورت مسلم جج کی عدالت یا موجودہ دار القضاء یا شرعی پنچایت میں دعوی دائر کر کے گواہوں سے اپنا مدعا ثابت کر دیتی ہے اور قاضی حسب شرائط نکاح فسخ کر دیتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ معتبر ہوگا اور اس میں شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہوگی۔

لیکن زوجین میں تفریق کے لئے قضاء قاضی شرط ہے۔

مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ مزید یہ اسباب بھی تفریق کے اسباب میں سے ہیں:

(۱) غیر کفو میں نکاح (۲) مہر کے اندر غیر معمولی کمی (۳) خیار بلوغ (۴) شوہر کا جذام، برص یا اس جیسے کسی موذی مرض میں مبتلا ہونا (۵) شوہر کا ادائیگیٔ نفقہ سے عاجز ہونا (۶) زوجین میں شقاق کا پایا جانا (۷) مرد کا اپنی حالت کے بارے میں عورت کو دھوکے میں ڈال کر نکاح کرنا (۸) تفریق بسبب حرمت مصاہرت (۹) تفریق بسبب فساد نکاح (تفصیل کے لئے دیکھیں: اسلامی قانون متعلق مسلم پرسنل لا ء ۲۲۱ دفعہ ۷۳)

شوہر کا حقوق زوجیت ادا نہ کرنا

دفعہ ۷۳:

ترک مجامعت اور بیوی کو معلقہ بنا کر رکھنا بھی تفریق کے اسباب میں سے ایک سبب ہے. کیوں کہ حقوق زوجیت کی ادائیگی واجب ہے، حقوق زوجیت ادا نہ کرنا اور بیوی کو معلقہ بنا کر رکھنا ظلم ہے اور رفع ظلم قاضی کا فریضہ ہے، نیز صورت مذکورہ میں عورت کا معصیت میں مبتلا ہونا بھی ممکن ہے، قاضی کا فریضہ ہے کہ ایسے امکانات کو بند کر دے، اس لئے اگر عورت قاضی کے یہاں مذکورہ بالا شکایت کے ساتھ مرافعہ کرے تو قاضی تحقیق حال کے بعد لازمی طور پر رفع ظلم کرے گا اور معصیت سے محفوظ رکھنے کے مواقع پیدا کرے گا، مذہب مالکی میں بھی ترک مجامعت وجہ تفریق ہے۔ (مجموعۂ قوانین اسلامی: ۱۹۲۔ ۱۹۳، شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

شوہر کا وطی پر قادر نہ ہونا

دفعہ (۷۴)

وطی پر قادر نہ ہونے کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً شوہر مقطوع الذکر ہے، یا آلہ ٔتناسل اتنا چھوٹا ہے کہ اس کے باعث وہ صحبت پر قادر نہیں ہے، یا آلہ ٔتناسل موجود ہے لیکن کسی مرض کے باعث عورت سے جماع پر قادر نہیں ہے تو ان تمام صورتوں میں عورت کو قاضی کے ذریعہ نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، پہلی اور دوسری صورت میں قاضی فوراً نکاح ختم کردے گا، اور تیسری صورت میں ایک قمری سال تک علاج کی مہلت دے گا، علاج کے بعد بھی جماع پر قادر نہ ہوسکا تو عورت کے مطالبہ پر فوراً قاضی نکاح فسخ کردے گا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی ص ۱۹۳)

"لَوْ وجدتُ الْمَرْأَةُ زَوْجهَا مَجْبُوبًا خَيَّرَهَا الْقَاضِي لِلْحَالِ وَلَا يُؤَجِّلُ, كَذَافِي فَتَاوَى قَاضِي خَانْ. وَيَلْحَقُ بِالْمَجْبُوبِ مَنْ كَانَ ذَكَرُهُ صَغِيرًا جِدًّا كَالزِّرِّ." (الفتاوى العالمكيرية، باب العنين ج ۱ ص ۵۲۵ -الدر المختار ۲/ ۲۸۱)

" ولو وجدته عنينا.... (أو خصيا) لا ينتشر ذكره.... (أجل سنة).... (قمرية).... (فإن وطئ مرة) فبها (وإلا بانت بالتفريق) من القاضي إن أبى طلاقها.... (بطلبها) (الدر المختار: ۲/ ۲۱۸-۲۲۰)

مجموعہ قوانین اسلام کے دفعہ ۱۲۲ "تفریق بسبب نامردی" کی عبارت یوں ہے:

۱۔جس عورت کا نکاح شرع اسلام کے بموجب منعقد ہوا ہو بریں بنا عدالت سے تنسیخ کا حکم حاصل کرسکتی ہے کہ اس کا شوہر بوقت نکاح نامرد تھا، نیز یہ کہ اس کی وہ حالت برقرار ہے۔

۲۔شوہر کی درخواست پر عدالت پر لازم ہوگا کہ بربنا نامردی تنسیخ نکاح کا حکم جاری کرنے سے قبل شوہر کو ایک سال کی مہلت دے تاکہ شوہر اس ایک سال کی مدت میں عدالت کو مطمئن کر سکے کہ وہ نامرد نہیں رہا، اگر شوہر اس مدت میں عدالت کو مطمئن کرسکا تو عدالت نامردی کی بنا پر تنسیخ نکاح کا حکم دینے کی مجاز نہ ہوگی۔ (مجموعہ قوانین اسلام ج ۲/ ۶۳۰)

نامرد کی تعریف

" فقہی اصطلاح میں نامرد (عنین) اس شخص کو کہتے ہیں جو عضو تناسل رکھنے کے باوجود عورت سے جماع کرنے پر قادر نہ ہو، خواہ یہ حالت پیدائش سے ہو یا کسی مرض کے سبب پیدا ہوئی ہو یا کمزوری یا بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔

اگر کوئی ایسا شخص جو بعض عورتوں سے جماع کرنے پر قادر ہے مگر بعض عورتوں سے جماع کرنے پر قادر نہیں تو

وہ شخص ان بعض عورتوں کے حق میں جن سے جماع کرنے پر قادر نہیں ہے نامرد سمجھا جائے گا، یا جس مرد کو عورت کی مخالطت سے قبل ہی انزال ہوجاتا ہو نامرد سمجھا جائے گا، ایسے مرد کی زوجہ کو جو اس سے جماع پر قادر نہ ہو، شریعت نے بذریعہ عدالت طلب تفریق کا اختیار دیا ہے اور یہ اختیار زوجہ کے مطالبہ کی تاخیر سے خواہ کتنا عرصہ گزر جائے، باطل نہیں ہوتا۔"

(مجموعہ قانون اسلامی ۲/۱۳۱-۶۳۔ بحوالہ فتاوی عالمگیری ۲/۱۵۵۔ رد المحتار:۲/۶۸۱۔ الحیلۃ الناجزۃ بہ تحقیق و تسہیل جدید:۷۸-۷۹)

"العنين: هُوَ الَّذِي لَا يَصِلُ إِلَى النِّسَاءِ مَعَ قِيَامِ الْآلَةِ فَإِنْ كَانَ يَصِلُ إِلَى الثَّيِّبِ دُونَ الْأَبْكَارِ أَوْ إِلَى بَعْضِ النِّسَاءِ دُونَ الْبَعْضِ، وَذَلِكَ لِمَرَضٍ بِهِ أَوْ لِضَعْفٍ فِي خَلْقِهِ أَوْ لِكِبَرِ سِنِّهِ أَوْ سِحْرٍ فَهُوَ عِنِّينٌ فِي حَقِّ مَنْ لَا يَصِلُ إِلَيْهَا كَذَا فِي النِّهَايَةِ." (العالمكيرية: ۱/۲۲-الباب الثاني عشر من الطلاق)

وفي رد المحتار: "اى مع وجود الآلة سواء كانت تقوم أو لا." (ردالمحتار: ۲/ ۵۹۳-باب العنين)

جبکہ "ردالمحتار" میں "المعراج" کے حوالہ سے یہ بھی ہے:

"إِذَا أَوْلَجَ الْحَشَفَةَ فَقَطْ فَلَيْسَ بِعِنِّينٍ وَإِنْ كَانَ مَقْطُوعَهَا فَلَا بُدَّ مِنْ إِيلَاجِ بَقِيَّةِ الذَّكَرِ. قَالَ فِي الْبَحْرِ: وَيَنْبَغِي الِاكْتِفَاءُ بِقَدْرِهَا مِنْ مَقْطُوعِهَا. (الحيلة الناجزة:۸۷)

نامردی کی صورت میں تفریق کی شرطیں

واضح رہے کہ عنین کی بیوی کو اپنے شوہر سے علاحدگی کا اختیار مندرجہ ذیل چند شرائط کے ساتھ ہے:

(۱) نکاح سے پہلے عورت کو اس شخص کے عنین ہونے کا علم نہ ہو، اگر اس وقت علم تھا پھر بھی نکاح کر لیا تو اب تفریق کا حق نہ ہوگا۔

(۲) نکاح کے بعد ایک مرتبہ بھی اس عورت سے جماع نہ کیا ہو، اگر ایک مرتبہ جماع کر چکا ہو تو پھر عنین ہو گیا ہو تو عورت کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہوگا۔

(۳) جب سے عورت کو شوہر کے عنین ہونے کی خبر ہوئی ہے اس وقت سے عورت نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی صراحت نہ کی ہو، مثلاً یہ نہ کہا ہو کہ جیسا بھی ہے اب تو میں اس کے ساتھ بسر کروں گی، کیونکہ اگر وہ اپنی رضا کی تصریح کر چکی ہو تو پھر اس کو مطالبہ تفریق کا حق نہیں رہتا، لیکن محض سکوت سے اس جگہ رضا نہ سمجھی جائے گی۔

(۴) جس وقت سال بھر کی مدت گزر جانے کے بعد قاضی عورت کو اختیار دے تو عورت اسی مجلس میں تفریق اختیار کر لے، اگر اس مجلس میں اس نے اپنے خاوند کے ساتھ رہنا پسند کر لیا یا اس قدر سکوت کیا کہ مجلس برخاست یا

تبدیل ہوگئی تو اب کسی طرح تفریق نہیں ہوسکتی۔

(۵) عنین کو سال بھر کی مہلت دینا، سال گزرنے پر عورت کو اختیار رہنا اور خاوند کا طلاق دینے سے انکار کرنا تو تفریق کر دینا وغیرہ امور قاضی کے فیصلے کے محتاج ہیں، قاضی کے فیصلے کے بغیر از خود عورت کو تفریق کا اختیار نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الحیلۃ الناجزۃ: ۸۳ تا ۸۶)

تفریق بسبب ظلم وضرر

" زوجہ اپنے شوہر کے ظلم وضرر کے سبب بذریعہ عدالت تفریق طلب کرنے کی مجاز ہے۔" (مجموعہ قوانین اسلام: ۲/ دفعہ ۱۲۸)

دفعہ ۱۲۹

''شوہر کے ظلم کے سبب عدالت زوجین میں جو تفریق کرائے گی وہ بمنزلہ ایک طلاق بائن کے ہوگی''۔ (ایضا)

واضح رہے کہ شوہر کی طرف سے بیوی پر ظلم وزیادتی نیز شقاق یعنی ایک دوسرے سے نفرت، عداوت اور دشمنی کی بنیاد پر فسخ نکاح احناف کے نزدیک نہیں ہے، لیکن ضرورت وحاجت کے پیش نظر احناف نے امام مالک کا قول اختیار کرلیا ہے، موجودہ دارالقضاؤں کا عمل اسی پر ہے۔

" شقاق" کا مفہوم یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تعلقات آخری درجہ میں خراب ہوجائیں، ان کے درمیان نفرت پیدا ہوجائے اور وہ یہ سمجھیں کہ اب ان کا ایک ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے زندگی گزار پانا مشکل ہے، خواہ یہ نفرت بیوی کو تکلیف دہ مار پیٹ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو یا بیوی کے نشوز یا دونوں خاندانوں میں دشمنی یا دیگر وجوہات سے پیدا ہوئی ہو۔

یہ بھی واضح رہے کہ ایک فریق کی طرف سے بھی تنفر ہوتو شقاق متحقق ہوجائے گا، اس لیے کہ ایک فریق نفرت کرے گا، دوسرا نہ کرے تب بھی وہ الگ گوشہ اختیار کرنے والا قرار دیا جائے گا۔ (اسلامی عائلی قوانین: ۱۷۶-۱۷۷)

شوہر کا کسی موذی مرض میں مبتلا ہونا

اگر شوہر جذام، برص یا ان جیسے کسی موذی مرض میں نکاح کے بعد مبتلا ہوا تو عورت کی درخواست پر قاضی تحقیق حال اور ثبوت شرعی کے بعد شوہر کو ایک قمری سال علاج کی مہلت دے گا، اس کے بعد بھی اگر افاقہ نہ ہوا اور بیوی پھر تفریق کا مطالبہ کرے تو قاضی تفریق کر دے گا۔

تشریح:

اگر شوہر نکاح کے پہلے سے ان امراض میں مبتلا تھا اور عورت کو بھی پہلے سے اس کا علم تھا، اس کے باوجود عورت

نے نکاح کیا تو اب اسے مطالبہ تفریق کا حق حاصل نہ ہوگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: ۱۹۴-دفعہ ۷۵)

"مجموعہ قوانین اسلام" ج ۲ / ۶۱۰-دفعہ ۱۲۱ یوں ہے:" شوہر میں ایسے تناسلی یا متعدی مرض یا عیب کی بناء پر جو اتصال جنسی میں مانع ہو یا شوہر کی طرف سے زوجہ کی طبیعت میں ایسا تنفر پیدا کرنے کا موجب ہو جو باہمی معاشرت کو ناممکن بنا دے، زوجہ کو حق ہوگا کہ بذریعہ عدالت تنسیخ نکاح کا حکم حاصل کر لے۔ مگر لازم ہوگا جہاں تک ممکن ہو مجموعہ ہٰذا کے احکام مندرجہ باب ہذا کا اطلاق کیا جائے گا۔" (مجموعہ قوانین اسلام ۲ / ۶۱۰)

مجنون کی بیوی کا حکم

مجنون کی بیوی کے لیے خیار فسخ کچھ شرائط کے ساتھ ہیں اور جنون کی دونوں صورتوں میں فسخ کا اختیار ہے، خواہ عقد نکاح کے وقت جنون موجود ہو اور بے خبری میں نکاح ہو جائے یا عقد کے وقت جنون نہیں تھا مگر نکاح کے بعد لاحق ہو گیا ہو، خواہ ہم بستری سے پہلے ہو گیا ہو یا بعد میں ہو گیا ہو، البتہ پہلی صورت میں امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی اختیار ہوگا اور مالکیہ کے نزدیک بھی، جب کہ دوسری صورت عقد نکاح کے بعد پیدا ہونے والے جنون میں صرف مالکیہ کے نزدیک اختیار ہوگا۔

اس لیے مجنون کی بیوی کو خیار فسخ حاصل ہونے کے لیے درج ذیل شرطیں ہیں:

۱-عورت کی طرف سے رضامندی نہ پائی جائے، اگر نکاح سے پہلے جنون کا پتہ تھا اور اس کے باوجود نکاح کیا گیا تو خیار فسخ حاصل نہیں ہوتا اور اگر نکاح کے بعد جنون ہوا ہو تو یہ شرط ہے کہ جنون کی خبر ہونے کے بعد اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی ظاہر نہ کی ہو، اگر ایک مرتبہ بھی رضامندی ظاہر کر چکی، تو خیار فسخ باطل ہو گیا۔

۲-جنون کا پتہ لگنے کے بعد اپنے اختیار سے عورت نے جماع یا دواعیٔ جماع کا موقع نہ دیا ہو، البتہ اگر مجنون نے جبر واکراہ سے ہم بستری وغیرہ کر لی تو اس سے خیار ساقط نہیں ہوتا۔ (الحیلۃ الناجزۃ: ۲۹۷-۲۹۸)

مفقود الخبر کی بیوی کا حکم

مفقود الخبر سے مراد ایسا لا پتہ شخص ہے، جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے، لا پتہ شخص کی بیوی کا حکم یہ ہے کہ وہ دار القضاء میں فسخ نکاح کا دعوی دائر کرے اور بذریعہ شہادت شرعیہ ثابت کرے کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، اس کے بعد گواہوں سے اس کا لا پتہ ہونا ثابت کرے، اس کے بعد قاضی کی ذمہ داری ہوگی کہ خود لا پتہ شخص کی تفتیش وتلاش کرے اور جب پتہ ملنے سے مایوس ہو جائے تو عورت کو چار سال تک مزید انتظار کا حکم کرے پھر اگر ان چار سال کے اندر بھی لا پتہ شخص کا پتہ نہ چلے تو لا پتہ شخص کو اس کی مدت کے ختم ہونے پر مردہ تصور کیا جائے گا اور ان چار سال کے ختم ہونے کے بعد چار ماہ دس دن عورت کو عدت وفات گزار کر دوسری جگہ نکاح کا

اختیار ہوگا۔

لاپتہ شخص کی بیوی کے لیے یہ چار سال کے مزید انتظار کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ عورت اتنی مدت صبر وتحمل اور عفت کے ساتھ گزار سکے، لیکن یہ صورت ممکن نہ ہو، یعنی عورت کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اور اس نے ایک عرصہ دراز تک لاپتہ شخص کا انتظار کرنے کے بعد مجبور ہوکر اس حالت میں درخواست دی ہو تو اس صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ چار سال کی میعاد میں تخفیف کر دی جائے، کیونکہ جب عورت کے ابتلا کا اندیشہ ہو تو فقہاء کے نزدیک کم از کم ایک سال صبر کرنے کے بعد تفریق جائز ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ ۳۰۰ / ۳۰۸) اسلامی عائلی قوانین ۱۶۷۔ مجموعہ قوانین اسلامی ۱۹۵۔ دفعہ: ۷۷)

غائب غیر مفقود شخص کا حکم

ایسا شوہر جو بالکل لاپتہ نہ ہو لیکن اس کا کوئی متعین پتہ بھی نہ ہو، کبھی یہاں اور کبھی وہاں ہونے کو سنا جاتا ہو، لیکن بیوی کے پاس نہ آتا ہو اور نہ بیوی کو اپنے پاس بلاتا ہو، نہ اس کے خرچ وغیرہ کا خیال رکھتا ہو، نہ بیوی کو طلاق دے کر آزاد کرتا ہو بلکہ معلقہ بنا کر ایسی تنگی اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہو کہ بیوی کے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے سنگ دل وظالم شوہر کو "غائب غیر مفقود" کہا جاتا ہے، ایسے غائب شخص کی بیوی کو حق ہے کہ اپنے شوہر سے رہائی حاصل کرنے کے لیے دارالقضاء میں درخواست دے، درخواست دیتے وقت ان امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

۱۔ بیوی گواہوں کے ذریعے غائب غیر مفقود شوہر کے ساتھ اپنا نکاح ثابت کرے۔

۲۔ یہ بھی ثابت کرے کہ وہ نفقہ دے کر نہیں گیا ہے۔

۳۔ اور یہ بھی کہ اس نے نفقہ معاف نہیں کیا ہے۔

نکاح اور وجوب نفقہ کے ثابت ہونے کے بعد قاضی اس غائب غیر مفقود شخص کے پاس حکم بھیجے گا اور ضابطے کی کارروائی سے گزرنے کے بعد عورت کے مطالبہ تفریق پر نکاح فسخ کرے گا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اسلامی عائلی قوانین ۱۶۳۔۱۶۵۔ الحیلۃ الناجزہ ۳۰۰ تا ۳۰۸۔ مجموعہ قوانین اسلامی ۱۹۷۔ دفعہ: ۷۸)

فسخ نکاح کے بعض جدید اسباب اور تطبیقات

۱۔ فالج لقوہ وغیرہ۔

ازدواجی زندگی میں جائز طریقے سے خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے ہر وہ مرض جو مانعِ جماع ہو موجب تفریق ہوسکتا ہے، اگر شوہر کو فالج ہوجائے یا اس کا ایکسیڈنٹ ہوجائے جو مردانہ قوت پر اثر انداز ہو تو اس کی تین صورتیں ہوں گی:

۱۔فالج زدہ یا ایکسیڈنٹ سے متاثر شوہر کے ساتھ اگر بیوی رہنا چاہے تو تفریق کی نوبت نہیں آئے گی،وفادار بیوی کو ایسا ہی کرنا چاہیے،شوہر نے اپنی صحت کے زمانے میں اس کا خیال رکھا ہے تو بیماری کے زمانے میں بیوی کو شوہر کا خیال رکھنا چاہیے،اگر بیوی ساتھ رہنا چاہے تو کوئی جدا نہیں کرسکتا۔

۲۔اگر بیوی ساتھ رہنا چاہتی ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ فالج کس حد تک پہنچا ہوا ہے،اگر وہ مانع جماع نہیں ہے بلکہ فالج وغیرہ کے باوجود شوہر جماع پر قادر ہے تو ایسی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا اور اسے معمولی بیماریوں پر قیاس کیا جائے گا،اگر وہ فسخ نکاح کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مطالبہ رد کردیا جائے گا۔

۳۔لیکن اگر فالج کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ وہ جماع پر قادر نہیں اور نہ صحت یابی کے روشن امکانات ہیں تو بیوی کو تفریق کا مطالبہ اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے دوسرے نکاح کی خواہش کرنے کا حق ہے،ایسی صورت میں پہلے تو شوہر سے طلاق لینے کی کوشش کی جائے گی،اگر طلاق دے دے تو بہتر ہے،ورنہ قاضی اس کی بیوی کی مجبوری سمجھ کر خلع کا مطالبہ کرے،اگر وہ خلع قبول کرلے تو ٹھیک ہے،خلع سے بیوی بائنہ ہوکر جدا ہوجائے گی،ورنہ قاضی فوراً فسخ کردے گا،فوری فسخ نکاح کو مجبوب کے مسئلے پر قیاس کیا جائے گا،مجبوب اور وطی پر غیر قادر شوہر کے بیان میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر فالج زدہ شخص کی صحت کی امید اور توقع ہو تو عنین کی طرح علاج معالجے کا موقع اور مہلت دی جائے گی اور فالج کے ماہر ڈاکٹروں کے مشورے سے مدت متعین کی جائے گی،عنین کی طرح ایک سال کی مہلت کافی نہ ہوگی۔ لیکن یہ بھی خیال رہے عموماً فالج وغیرہ میں وقت زیادہ لگتا ہے،علاج لمبا چلتا ہے،اور فائدہ بہت سست روی کے ساتھ ہوتا ہے،بسا اوقات شفاء کا سلسلہ ٹھہر جاتا ہے،ایسی صورت میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ عورت کو کتنا انتظار کرنا پڑسکتا ہے یا کتنا صبر اور جبر کرنا پڑے گا۔ اس لئے یہ معاملہ عورت کی قوّتِ برداشت اور تحمل کے امتحان سے بھی وابستہ ہے، اور موجودہ پرفتن اور بے حیائی اور فحاشی کا ماحول سب کے علم ونظر کے سامنے ہے۔

ایسی بیماری جس سے حقِ زوجیت کی ادائیگی نہ ہوسکے۔

کبھی شوہر ایسی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے جس میں جماع کی قوت ختم ہوجاتی ہے اور بیماری لاعلاج ہوتی ہے، موذی یا متعدی ہوتی ہے،تو ایسی صورت میں بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو اور اپنی عفت وعصمت کے تحفظ کیلئے تفریق چاہتی ہو تو شوہر کو طلاق یا خلع پر آمادہ کرنے کے بعد اگر کوشش کامیاب نہ ہوسکے تو عورت قاضی سے فسخ اور تفریق کا مطالبہ کرسکتی ہے،اور قاضی مجبوب کی طرح یہاں بھی فوراً تفریق کردے گا۔

"قال محمد علیہ الرحمۃ: إن كان بالزوج عيب لا يملك الوصول إلى زوجته فالمرأة مخيرة بعد ذلك. ينظر إن كان العيب كالجنون الحادث والبرص ونحوهما فهو والعنة سواء، فينتظر حولاً، وإن كان

الجنون أصليا أو به مرض لا يرجي برؤه فهو والجب سواء، وهي بالخيار، إن شاءت رضيت بالمقام معه وإن شاءت رفعت الأمر إلى الحاكم حتى يفرق بينهما."(الحيلة الناجزة ٩٠/ نقلا عن الفتاوى الحمادية: ٧٦)

" مجموعہ قوانین اسلام" میں ہے:" ہر وہ مرض جو مانع جماع ہو موجب تفریق ہوسکتا ہے۔" (مجموعہ قوانین اسلام ٢/ ٦٢٢)

شوہر کی ایسی بیماری جو باعث نفرت ہو

اگر شوہر ایسی بیماری میں مبتلا ہو جو عورت کے لیے باعث نفرت ہو جیسے برص، جذام، یا ایسی کوئی بیماری جس سے قوت جماع ختم تو نہ ہو، لیکن تنفر کا سبب ہو، یا جنسی آسودگی اور قربت حاصل نہ ہو سکے تو امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک عورت تفریق کا مطالبہ کرسکتی ہے، یہی مسلک راجح ہے، ایڈز اور علاج ٹی بی اور کینسر وغیرہ متعدی اور مہلک بیماریوں میں بھی بیوی کے مطالبہ پر تفریق کردی جائے گی۔

عمر قید کی سزا یافتہ شوہر

کسی جرم میں عمر قید کی سزا یافتہ شوہر جس کی رہائی کی ساری کوششیں ناکام ہو جائیں اور اس کی بیوی اپنی عفت وعصمت پر خطرہ اور اندیشہ محسوس کرے تو اس کی بیوی کو تفریق کا مطالبہ کرنے کا حق ہوگا۔ پہلے شوہر سے طلاق دینے یا بصورت دیگر خلع دینے کا مطالبہ کیا جائے گا، جب طلاق اور خلع میں کامیابی نہ مل سکے تو عدم ادائے نان ونفقہ، عدم وطی اور عفت وآبرو کی حفاظت وغیرہ کو علت اور بنیاد بنا کر دارالقضاء یا محکمہ شرعیہ کے ذریعے فسخ نکاح کردیا جائے گا، اگر اتفاق سے شوہر قید سے رہا ہو کر آجائے تو بیوی نے اگر دوسرا نکاح نہیں کیا تھا تو دوبارہ اس سے نئے مہر کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے اگر وہ دوسرا نکاح کرچکی ہو تو وہ نکاح باقی رہے گا، کیونکہ سابق شوہر سے نکاح فسخ ہو چکا ہے اور فسخ نکاح طلاق بائن کے حکم میں ہوتا ہے۔

اگر شوہر سے رابطہ ناممکن ہو تو فسخ نکاح کا فیصلہ پیچیدگی پیدا کرسکتا ہے اس لیے کہ اگر وہ واپس آجائے تو خواہ عورت کے دوسرے نکاح کے بعد آئے یا دوسرے شوہر کے دخول کے بعد آئے دونوں سورتوں میں بیوی پہلے شوہر ہی کی ہوگی۔ (الحیلۃ الناجزۃ)

عہد نبوی میں ابلاغ کے ذرائع

مولانا منور سلطان ندوی
(رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

اپنے خیالات دوسروں تک پہونچانے کو ابلاغ کہا جاتا ہے، انگریزی زبان میں ابلاغ کے لئے communication کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ اصلا لاطینی لفظ ہے، جس کا معنی ہے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔ (تعلقات عامہ، ازمہدی حسن، مکتبہ کارواں لاہور)

اردو میں ابلاغ کا لفظ عربی سے آیا ہے، ابلاغ لفظ بلغ سے بنا ہے، عربی میں بلغ کے معنی پہونچنا اور ابلغ کے معنی پہونچانے کے آتے ہیں، اسی سے تبلیغ کا لفظ بھی بنا ہے، قرآن کریم میں بلّغ کا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے:

یا أیھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته۔ (المائدہ:٦٧)

اے پیغمبر! جو کتاب آپ کے رب کی طرف سے آپ پر اتاری گئی ہے اسے لوگوں تک پہونچاتے رہیے، اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو آپ نے پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔

الذین یبلغون رسلت اللہ و یخشو نه و لا یخشون احدا الا اللہ و کفی باللہ حسیبا۔ (احزاب: ۳۹)

پیغمبر وہ لوگ ہیں جو اللہ کا پیغام پہونچاتے ہیں، اور اسی سے ڈرتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں کرتے، اور حساب لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔

أبلغکم رسلت ربی و انا لکم ناصح امین۔ (اعراف:٦٨)

میں اپنے پروردگار کے پیغامات کو تم تک پہونچاتا ہوں، اور میں تمہارا ایسا خیرخواہ اور امانت دار ہوں۔

و ما علینا الا البلاغ المبین۔ (یسین:١٧)

اور ہماری تو صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ واضح طور پر اللہ کا پیغام پہونچا دیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ابلاغ کا ذکر اس طرح کیا گیا:

قال رب انی دعوت قومی لیلا و نہارا، فلم یزدھم دعائی الا فرارا، و انی کلما دعوتھم لتغفر لھم

جعلوا اصابعهم فی آذانهم و استغشوا ثیابهم و اصروا و استکبروا استکبارا، ثم انی دعوتهم جهارا ثم انی اعلنت لهم و اسررت لهم اسرارا فقلت استغفروا ربکم انه کان غفارا۔ (نوح:۵۔۱۰)

نوح نے عرض کیا: اے میرے پروردگار میں اپنی قوم کو دن ورات دین حق کی طرف بلاتا رہا، تو وہ میرے بلانے پر اور زیادہ بھاگتے ہی رہے، میں نے جب جب ان کو بلایا تاکہ آپ ان کو بخش دیں تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، اپنے کپڑے اوڑھ لئے، اڑ گئے اور بڑے غرور کرنے لگے، پھر بھی میں ان کو کھلے طور پر بلاتا رہا، اعلانیہ بھی سمجھایا اور پوشیدہ طور پر بھی، میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بڑے بخشنے والے ہیں۔

قرآن مجید میں اس مقصد کے لئے دعوت، انذار، تبشیر اور دیگر الفاظ بھی آئے ہیں:

یاأیها النبی انا أرسلنک شاهدا و مبشرا و نذیرا و داعیا الی الله باذنه و سراجا مبینا۔ (احزاب: ۴۵۔۴۶)

اے پیغمبر! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

عربی میں ذرائع ابلاغ کی مخصوص شکل کو اعلام کہا جاتا ہے، اعلام کے لفظ میں وسعت اور گہرائی دونوں بہت زیادہ ہے، کیونکہ اس میں انذار اور تبلیغ کے معانی بھی پائے جاتے ہیں، علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

وأصل الانذار الاعلام، و النذیر المنذر، وهو المحذر فعیل بمعنی مفعل۔۔۔ المعلم الذی یعرف القوم بما یکون قد دهمهم من عدو او غیره وهو المخوف ایضا و نذر جمع نذیر بضمتین۔ (تاج العروس من جواهر القاموس، ج ۱۴، ص: ۲۰۰)

انذار اصلا اعلام ہی کی ایک شکل ہے، اور نذیر منذر کو کہا جاتا ہے، یعنی باخبر کرنے والا، جس طرح فعیل مفعل کا معنی دیتا ہے، اور معلم وہ ہے جو قوم کو دشمن وغیرہ سے آگاہ کرتا ہے، اسی کو مخوف بھی کہا جاتا ہے۔

اور ابن سیدہ لکھتے ہیں:

و الاعلام التبلیغ، یقال بلغت القوم بلاغا ای اوصلتهم بالشئ المطلوب، و البلاغ ما بلغک ای وصلک و اعلمت کآذنت۔ (المخصص ج ۱، ص: ۲۵۸، لابن سیده ابی الحسن علی بن اسماعیل النحوی اللغوی الاندلسی، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۶ء)

اعلام کے معنی تبلیغ کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے: بلغت القوم بلاغا یعنی میں نے شئ مطلوب کو ان تک پہونچا دیا، اور بلاغ یعنی جو تم تک بات پہونچے، اور اعلمت کے معنی ہیں تم نے بات پہونچائی۔

اعلام کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

هو كل قول او فعل قصد به حمل حقائق او مشاعر او عواطف او افكار او تجارب قولية او سلوكية شخصية او جماعية الى فرد او جماعة او جمهور بغية التاثير، سواء اكان الحمل مباشرا بواسطة وسيلة اصطلح على انها وسيلة اعلام قديما او حديثا۔(مفاهيم اعلامية من القرآن الكريم، ص:۱۸، ۱۷، سيدمحمدساداتى الشنقيطى، ط: دارعالم الكتب، الرياض، ۱۹۸۶ء)

ہر وہ قول وفعل جس کا مقصود حقائق یا احساسات وجذبات یا افکار وتجربات یا شخصی اور اجتماعی معلومات کو تاثیر کی غرض سے فرد یا جماعت یا قوم تک پہونچانا، یہ پہونچانے کا یہ عمل براہ راست ہو یا کسی ایسے وسیلے سے ہو جو قدیم یا جدید وسیلہ کے طور پر اصطلاحا مستعمل ہو۔

محمد دلشاد کنور لکھتے ہیں:

ابلاغ اس علم یا ہنر کا نام ہے جس کے ذریعے کوئی شخص کوئی اطلاع دے، کوئی خیال، رویہ یا جذبہ کسی دوسرے شخص میں منتقل کرتا ہے۔(ابلاغ عامہ اور دور جدید، ص:۱۳ از محمد دلشاد کنور، اکیڈمک پریس، لاہور، ۱۹۶۸ء)

بعثت سے قبل عہد جاہلیت کے چند معروف ابلاغی وسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت اور اس سے قبل زمانہ جاہلیت میں ابلاغ کے متعدد ذرائع متعارف تھے، یہ ذرائع اس دور کی علمی وتہذیبی ترقی کے تناظر میں نہایت موثر تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمانہ جاہلیت میں مروج ابلاغی ذرائع کا استعمال فرمایا، ساتھ ہی آپ کے دور میں نئے ابلاغی وسائل بھی وجود میں آئے، ان ذرائع نے آپ کے پیغام کو عام انسانوں تک پہونچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔

عہد جاہلیت کے ابلاغی وسائل کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے، خارجی وسائل، اور داخلی وسائل (یعنی وہ وسائل جو اندرون جزیرہ عرب معروف ومروج تھے)

خارجی وسائل میں سے سب سے اہم وسیلہ تجارت تھی، اس دور میں تجارت جہاں معاش کا بڑا ذریعہ تھی وہیں ابلاغ کا بھی بہترین ذریعہ تھی، تجارت کے ذریعہ جہاں لوگ مادی اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وہیں ایک علاقے کی خبریں اور وہاں کے تمدنی جلووں کو بھی منتقل کرتے تھے، یورپی تجار اور جزیرہ عرب کے تجار کا یہی حال تھا، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جزیرہ عرب دیگر ممالک سے بالکل کٹا ہوا تھا، مگر احمد امین کے بقول یہ خیال غلط ہے، عرب اپنے گرد کے ممالک سے مادی اور علمی دونوں لحاظ سے باخبر تھے، اور ان سے جڑے ہوئے تھے۔ (فجر الاسلام، ۳۲)

زمانہ جاہلیت میں ابلاغ کے داخلی وسائل درج ذیل تھے:

۱۔شاعری

۲۔خطابت

۳۔آوازلگانا

آوازلگانے کا طریقہ مختلف شکلوں میں مروج تھا،مثلا پہاڑ کی چوٹیوں پر آگ جلانا،ڈھول بجانا،شہروں اور دیہاتوں میں آوازلگا کرکسی بات کا اعلان کرنا۔

۴۔عید

ہر دور میں عید کی اہمیت رہی ہے،عربوں میں مختلف عیدیں منائی جاتی تھیں،مثلاً عید الشباب کسی قبیلہ کے مفاخر کو بیان کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

۵۔بازار

علامہ آلوسی نے اپنی کتاب بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب''میں عرب کے بازاروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بازاریں صرف اشیاء کی خرید وفروخت کا ذریعہ نہیں تھیں بلکہ فکری اور ادبی سرمایہ کو پیش کرنے کا بہترین مرکز تھیں،یہاں تک کہ بازار میں ہی قبائل کے آپسی جھگڑوں کے فیصلے ہوتے،وہیں جنگوں کا اعلان ہوتا،خطبااور شعرااپنے فنی جوہر بھی یہیں دکھاتے تھے۔(الاعلام فی صدر الاسلام، از عبداللطیف حمزہ،ص:۳۰)

عرب میں بہت سے بازار معروف تھے،چند بازاروں کے نام اس طرح ہیں:سوق دومۃ الجندل،سوق المشقر،سوق ہجر،سوق عکاظ،سوق ذی المجاز،المربدوغیرہ

۶۔ندوات(خصوصی مجالس)

بازار کے بعد سب سے اہم ذریعہ الندوہ تھی،جہاں روساءاور صاحب رائے افراد جمع ہوتے اور باہم تبادلہ خیال کرتے تھے،سیرت میں دارالندوۃ کی شہرت اسی بنیاد پر ہے۔

۷۔پہاڑ کی چوٹیوں پر آگ جلانا

جب کسی قبیلہ پر حملہ ہوتا یا کسی اہم بات کی خبر دینی ہوتی تو پہاڑ کی چوٹیوں پر آگ جلائی جاتی تھی۔

۸۔نذیر عریان

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جب کسی قبیلہ یا قوم کو کسی خطرہ سے آگاہ کرنا ہوتا تو کپڑے اتار کر اس بات کا اعلان کرتے،احادیث میں اس کا تذکرہ موجود ہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ کو نذیر عریان کے مشابہ قرار دیا۔(صحیح مسلم،کتاب الفضائل،باب شفقتہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی امتہ ومبالغتہ فی تحذیرہم ممایضرہم،حدیث نمبر:۲۲۸۳)

عہد رسالت کے ابلاغی وسائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جو ابلاغی وسائل مروج تھے ان کا استعمال فرمایا، ساتھ ہی متعدد ایسے وسائل کا اضافہ فرمایا جن سے عرب نا آشنا تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمانہ جاہلیت کے جن ذرائع کا استعمال فرمایا ان میں شاعری، خطابت، بازار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں شاعری کو نمایاں مقام حاصل تھا، عہد اسلام میں شاعری کو وہ مقام تو حاصل نہیں رہا، البتہ اس کے بالمقابل خطابت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی، کیونکہ خطابت میں لوگوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بازار اور ندوات کو بھی استعمال فرمایا، کیونکہ یہ دونوں انسانی زندگی سے زیادہ ہم آہنگ تھے۔

انفرادی ملاقات کے ذریعہ ابلاغ

ذرائع ابلاغ کی تمام شکلوں میں سب سے زیادہ اہمیت رابطہ کی ہوتی ہے، ابلاغ کا محور ہی فرد کے ذہن و دماغ تک رسائی ہے، اسی بنیاد پر تعلقات عامہ اور رابطہ عامہ کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہونچانے کے لئے سب سے پہلے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ براہ راست لوگوں سے ملاقات کا تھا، اس وقت تک علانیہ دعوت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انفرادی طور پر لوگوں سے ملتے اور انہیں اسلام کے بارے میں بتاتے، احمد حسن زیات لکھتے ہیں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغام کے لئے جو ذرائع استعمال کئے ان میں سب سے پہلے تو لوگوں کو براہ راست دعوت دی، یہ دعوت تو پہلے پہل خفیہ طور پر دی جاتی رہی، اور جب اعلانیہ طور پر دعوت کا حکم ملا تب بھی دیگر ذرائع استعمال کرنے کے بجائے براہ راست دعوت کو اپنائے رکھا، مثلا مکہ مکرمہ جو عرب کا مرکزی مقام تھا اور اسے مذہبی، سیاسی، اور معاشرتی لحاظ سے مرکزیت حاصل تھی، بیت اللہ کا احترام لوگوں کے دلوں میں نقش تھا، اس گھر کے زائرین اور حج کرنے والے دور دراز کے علاقوں سے چلے آتے، قریش کی سیادت اور برتری کو اکثر لوگ تسلیم کرتے تھے، عرب کی بڑی کاروباری منڈیاں مکے کے گردونواح میں تھیں، ان منڈیوں میں تاجروں کے علاوہ دیگر اہل فن بھی آتے اور اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے، چنانچہ یہ منڈیاں شعراء اور خطباء کی نشرگاہیں بننے لگیں۔ (تاریخ الادب العربی، از احمد حسن زیات، اردو ترجمہ تاریخ ادب عربی، از عبدالرحمن طاہر، ط: غلام علی اینڈ سنز، کراچی، ص:۶۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انفرادی طور پر لوگوں سے ملتے اور انہیں دین کی دعوت پیش کرتے، وہیں اجتماعی طور پر بھی لوگوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملاقات کی، عقبہ اولی اور عقبہ ثانیہ اس کے مظاہر ہیں، سیرت کی کتابوں میں بیعت عقبہ اولی اور بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

اجتماعی رابطہ کی ایک شکل خطابت بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا بھرپور استعمال فرمایا، اس کی تفصیلات آئندہ آرہی ہیں۔

قرآنی قصے

قرآن کریم میں عام لوگوں تک پیغام پہونچانے کے لئے قصوں کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ قصے اور کہانیاں دلوں میں جلد نفوذ کرتی ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کے سامنے قصے بیان کریں:

فاقص القصص لعلھم یتفکرون۔(اعراف:۱۷۶)

لہذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو تا کہ یہ کچھ سوچیں۔

نحن نقص علیک احسن القصص۔(یوسف:۳)

اے پیغمبر ہم آپ کو ایک بہترین واقعہ سنا رہے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کے قصوں کے بارے میں بتایا گیا:

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الابصار۔(یوسف:۱۱۱)

یقیناً ان کے واقعات میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لئے بڑا عبرت کا سامان ہے۔

قرآنی قصوں کے ساتھ غیر قرآنی قصوں کا بھی استعمال ہوا ہے، احادیث میں متعدد واقعات اور تمثیلات کا ذکر ہے۔

خطاب کے ذریعہ ابلاغ

خطبہ اور تقریر کے ذریعہ اپنی بات دوسروں کو پہونچانے کا طریقہ ابتدائے آفرینش سے جاری رہا ہے، یہ طریقہ ہمیشہ انسانی معاشرہ کا سب سے موثر وسیلہ ابلاغ سمجھا جاتا ہے، خطابت میں زبان دانی اصل ہے، اور عربوں کو اپنی زبان پر ناز تھا، فصاحت وبلاغت ان کے گھر کی لونڈی تھی، اس بناء پر عربوں میں خطابت کا بڑا زور تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطابت کے وسیلہ کو بڑے موثر طریقہ پر استعمال فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ہفتہ خطبہ دیتے، عید کے موقع پر خطبہ دیتے، وفود روانہ کرتے تو خطبہ دیتے، حج کے موقعہ پر جبل رحمت پر آپ نے خود خطبہ دیا، ان تمام خطبات کے چشمے قرآنی کے معانی سے ابلتے تھے۔(مع اللہ، از محمد غزالی، ص:۳۰۶)

بالکل ابتدائی دور میں جب آیت قرآنی 'وانذر عشیرتک الاقربین' نازل ہوئی تو آپ نے قبیلہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو کھانے پر مدعو کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا کھلایا، پھر ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کی، ابولہب نے سختی سے انکار کیا، اور برا بھلا بھی کہا، اس موقع پر ایک کم سن لیکن بلند حوصلہ نوجوان حضرت علی نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، اور آپ کے مشن کے ساتھ بھرپور مدد کا عہد کیا۔(پیام سیرت، ص:۱۰۶)

بیعت عقبہ اولی، عقبہ ثانیہ اور مدینہ میں مختلف مواقع پر آپ نے اجتماعی خطاب کا طریقہ اختیار فرمایا، احادیث میں اجتماعی وعظ وتذکیر کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، خاص طور پر فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے خطبات میں حقائق ومعانی

کے سمندر پوشیدہ ہیں۔

سیرت میں فتح مکہ کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے، یہ ابلاغ وترسیل کا بھی بہترین مظہر تھا، بڑی تعداد میں صحابہ کو براہ راست رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا، ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب فتح مکہ کے خطبہ کے ابلاغی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومما لا شک فیه ان هذا اللقاء العظیم بین المسلمین جمیعا ورسولهم ﷺ اتاح لهم فرصة واسعة امام کثیر ممن جائوا من مختلف البلاد، فتیسر لهم سماع کثیر عن الاسلام واحکامه، واتیح لهم ان یسألوه ویستفتوه فی کل مایحتاجون الیه من امور دینهم، کما اتاحت هذه الفرصة اللقاء بین جمیع المسلمین من مختلف انحاء الجزیرة، والاطمینان علی احوالهم وامورهم، ومثل هذه اللقاءات تسهل تناقل الدعوة وامورها وبیان احکامها وکل ما یتعلق بها... انه لون من ألوان الاعلام فرید، یجمع بین المسموع والمنظور، تتجاوب معه النفوس فتنزع الی العمل والتطبیق۔(اضواء علی الاعلام فی صدر الاسلام، ص: ۵۵، از دکتور محمد عجاج الخطیب، موسسة الرسالة، بیروت، طبع دوم ۱۹۸۷ء)

یقینا تمام مسلمانوں کی رسول اللہ ﷺ سے اس عظیم ملاقات سے مختلف علاقے سے آئے ہوئے لوگوں کو اسلام اور اس کے بنیادی احکام سے واقف ہونے کا وسیع تر موقع فراہم کیا، انہیں یہ موقع ملا کہ وہ اپنے دین سے متعلق جو کچھ معلومات چاہیں وہ پوچھ لیں، اسی طرح اس اجتماع سے تمام جزیرہ کے مسلمانوں کے لئے باہم ملنے اور ایک دوسرے کے احوال سے واقف ہونے کا فائدہ حاصل ہوا، اور اس طرح کی ملاقاتوں سے دعوت، امور دعوت اور اس کے احکام کا نشر آسان ہوجاتا ہے......ملاقات اعلام کی ایک منفرد شکل ہے کہ جس سے بیک وقت دیکھنے اور سننے دونوں کا فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، ساتھ ہی یہ دلوں کے ملاپ کا باعث اور عمل کا محرک بھی ہے۔

صفا پہاڑی کا استعمال

جب علانیہ دعوت کی اجازت ملی تو رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے جس وسیلۂ ابلاغ کا استعمال کیا وہ صفا پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو خطاب کرنا تھا، مکہ کا قدیم دستور یہ تھا کہ جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو لوگ صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اس کی اطلاع دیتے، رسول اللہ ﷺ نے بھی اس طریقہ کو اختیار فرمایا، احادیث اور سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیلات درج ہیں، سیرت کی معتبر کتابوں کے مطابق صفا پہاڑی پر بعض بت بھی نصب تھے، اس کے باجود رسول اللہ ﷺ نے اس قدیم طریقہ سے فائدہ اٹھایا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اس سے امت کو حاصل ہونے والے سبق کو بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طریقۂ دعوت سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ہر زمانہ وعہد میں جو جائز جدید ذرائع ابلاغ ہوں، دعوت دین کے لئے ان کا استعمال کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اہم کام کے لئے کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں فرمایا، ہر عہد، ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے مزاج ومذاق اور ذرائع ابلاغ کی ایجاد کے لحاظ سے مختلف وسائل سے دعوت الی اللہ کا کام لیا جائے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ان وسائل کا استعمال شرعا جائز ہو۔(پیام سیرت، ص: ۱۰۸، از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، علامہ سید سلیمان ندوی ریسرچ سنٹر، لکھنؤ)

مسجد اور منبر

اسلام میں مساجد کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسجد اجتماعیت کا بہترین مظہر ہے، مسجد کی حیثیت ایسے مرکز کی ہے جہاں سے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام پاتا ہے، بایں طور کسی بات کو عام لوگوں تک پہونچانے کے لئے اس سے بہتر جگہ نہیں ہوسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مسجد ابلاغ سے سب سے بہتر اور سب سے موثر وسیلہ کے طور پر استعمال ہوئی ہے، عہد نبوی میں مساجد میں انجام پانے والی سرگرمیوں پر غور کرنے سے متعدد ابلاغی پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے۔

ہر نماز سے قبل اذان، نماز کے لئے جماعت، جمعہ کی نماز کی امتیازی حیثیت، مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجالس ابلاغ کے موثر اسالیب ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں حلقوں کی شکل میں بیٹھ جاتے، قرآن پڑھتے، فرائض اور سنن کو سیکھتے۔(مجمع الزوائد)

عیدگاہ

اسلام میں عید کی نماز کی خاص اہمیت ہے، یہ بھی مسلمانوں کی اجتماعیت کا بہترین مظہر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیدین کی نماز کے لئے عیدگاہ جانے کا حکم فرمایا ہے، عیدگاہ میں علاقے کے مسلمانوں کا جمع ہونا، نماز سے قبل دینی رہنمائی، نماز بعد خطبہ یہ بھی ابلاغ کا موثر وسیلہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیدگاہ کو دینی ودعوتی مقصد کے ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی مصالح کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے، راوی بیان کرتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يخرج يوم الفطر والاضحى الى المصلى، فاول شئى يبدا به الصلاة ثم ينصر، فيقوم مقابل الناس، والناس جلوس على صفوفهم، فيعظهم ويوصيهم ويامرهم، فان كان يريد

ان یقطع بعثا قطعه او یامر بشئی امر به، ثم ینصرف ۔(صحیح البخاری، کتاب ابواب العیدین، باب الخروج الی المصلی بغیر منبر، حدیث نمبر: ۹۵۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھاتے، نماز سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے، تمام لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں وعظ ونصیحت فرماتے، اچھی باتوں کا حکم دیتے، اگر جہاد کے لئے کہیں لشکر بھیجنے کا ارادہ ہوتا تو اس کو الگ کرتے، کسی اور بات کا حکم دینا ہوتا تو وہ حکم دیتے، اس کے بعد شہر واپس تشریف لاتے۔

شاعری کا استعمال

عربوں کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا، شعر وشاعری کا خوب چرچا تھا، مختلف قبائل اپنی بڑائی بیان کرنے اور دوسروں کو نیچا دیکھانے کے لئے شاعری کرتے تھے، شاعری اس وقت کا سب سے موثر ہتھیار سمجھا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اہمیت وقبول کرتے ہوئے صحابہ کو اس کا بہترین استعمال سکھایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول معروف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاعری کے بارے میں فرمایا:

ان من الشعر لحکمة۔(صحیح البخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من الشعر والرجز والحداء ومایکره منه، حدیث نمبر: ۵۷۹۳)

بے شک کچھ اشعار حکمت ودانائی پر مشتمل ہوتے ہیں۔

مشرکین مکہ نے اشعار کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یلغار شروع کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو ترغیب دی کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ اس کا مقابلہ کریں، چنانچہ صحابہ نے نہ صرف مشرکین مکہ کے حملوں کا جواب دیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زبردست دفاع کیا، اور اس سے آگے بڑھ کر اسلام کا تعارف کرایا اور اسلامی اقدار کا موثر طریقہ پیش کیا، صحابہ نے اس میدان میں جو جوہر دکھائے وہ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں، اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت کعب بن مالک، حضرت حسان بن ثابت قابل ذکر ہیں۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

کان حسان وکعب یعارضان المشرکین بمثل قولهم بالوقائع والایام والمآثر، وکان ابن رواحه یعیرهم بالکفر وینسبهم الیه، فلما اسلموا وفقهوا کان اشد علیهم۔(سیر اعلام النبلاء، ج ۱، ص: ۲۳۳)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ جنگی واقعات، جنگی کارناموں اور خدمات کے ذریعہ مشرکین مکہ کے اشعار کا مقابلہ کیا کرتے تھے، اور حضرت رواحہ رضی اللہ عنہ کفر کے سلسلہ میں ان کو عار دلاتے تھے، اور کفر کی نسبت ان کی جانب کرتے

تھے، لیکن جب مشرکین مکہ مشرف بہ اسلام ہو گئے اور ان کے اندر شعور پیدا ہو گیا تو یہ اشعار ان پر بہت زیادہ شاق گزرنے لگے۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے اور یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

خلوا ابنی الکفار عن سبیله　　الیوم نصربکم علی تنزیله

ضربا یزیل الهام عن مقیله　　ویذهل الخیل عن خلیله

یہ منظر دیکھ کر حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اور حرم کے اندر اشعار پڑھتے ہو، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خل عنه یا عمر! فلهی اسرع فیهم من نضح النبل۔ (سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی انشاد الشعر، حدیث نمبر: ۲۸۴۷)

انہیں کہنے دو عمر! یہ اشعار ان پر (کفار و مشرکین) تیر برسانے سے بھی زیادہ زوراثر ہیں۔

حضرت حسان کی شان میں رسالت مآب کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ نہ صرف شاعری کو قابل استناد قرار دیتا ہے بلکہ اسلام کے دفاع کے لئے اس فن کے استعمال پر مہر ثبت کرتا ہے، آپ نے فرمایا:

یا حسان! اجب عن رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم ایده بروح القدس۔ (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب هجاء المشرکین، حدیث نمبر ۲۱۵۲، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابه، باب فضائل حسان بن ثابت، حدیث نمبر: ۶۵۳۹)

اے حسان! اللہ کے رسول کا دفاع کرو، حضرت جبرئیل تمہاری مدد کریں گے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ منبر رسول پر کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں فخریہ اشعار پڑھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرتے۔

تجارتی میلوں کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت جزیرۃ العرب میں مختلف بازار ہوا کرتے تھے، یہ بازار تجارتی اور تہذیبی دونوں اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل تھے، ان بازاروں میں جہاں تجارتی سامان کی خرید و فروخت ہوتی وہیں افکار و احوال کی ترسیل ہوتی، ادبی سرگرمیاں انجام پاتیں تھیں، قبائل کے مسائل بھی وہیں حل ہوتے تھے، اور خطباء اور شعراء اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، اس طرح کے بازاروں میں سوق دومۃ الجندل، سوق مشقر، سوق ہجر، سوق عکاظ، سوق مجنہ، سوق ذوالمجاز، سوق المربد قابل ذکر ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بازاروں کو اپنی دعوت کی ترسیل

کے لئے استعمال فرمایا۔

ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ لکھتے ہیں:

ووقف رسول الله ﷺ بعد مبعثه بثلاث سنوات فی عکاظ یدعو الناس الی الخیر والهدی والسعادة والایمان، وقد لزمه منذ قیامه بالدعوة حزن عمیق علی قومه الذین کفروا بنعمة الله، فعزم لیقصدن المواسم ولیاتین فیها القبائل، کل قبیلة بمنزلها وکل جماعة فی حیهم، یعرض علیهم هذا الدین قائم فی عکاظ، یقول: یاایهاالناس! قولوا لا اله الا الله تفلحوا وتنجحوا۔ (الاعلام فی صدر الاسلام، از ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ، ص: ۳۳، دار الفکر العربی، قاهره)

رسول اللہ ﷺ اپنی بعثت کے بعد مسلسل تین سال تک عکاظ کے میلے میں لوگوں کو خیر، ہدایت، سعادت اور ایمان کی دعوت دیتے رہے، آپ ﷺ کو دعوت کے روز اول سے ہی اپنی قوم کے کفار کی بڑی فکر دامنگیر تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ آپ حج کے موسم میں ہر قبیلہ اور ہر جماعت کے لوگوں کے پاس ضرور جائیں، اور ان کے سامنے دین کی دعوت پیش کریں، اور عکاظ کے میلے میں یہ اعلان کریں کہ اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہہ لو، کامیاب وکامران ہو جاؤ گے۔

مختلف علاقوں میں دعاۃ اور وفود بھیجنا

ابن اسحق بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ فتح مکہ اور تبوک سے فارغ ہوئے تو عرب کے ہر علاقے میں اپنا نمائندہ بھیجا، یہ نو ہجری کی بات ہے، اور اس مناسبت سے اس سال کو سنۃ الوفود بھی کہا جاتا ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص: ۵۵۹)

رسول اللہ ﷺ نے متعدد صحابہ کو مختلف علاقوں میں داعی بنا کر بھیجا، تاکہ وہ ان علاقوں میں اسلام کی دعوت پہونچائیں، ابتدائی دور میں حضرت مصعب بن عمیر کو مدینہ بھیجا، بئر معونہ کا واقعہ سیرت کی کتابوں میں معروف ہے، جہاں ستر داعی صحابہ شہید ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعوتی مشن پر روانہ فرمایا تھا، حضرت معاذ کو یمن، ابوموسی اشعری اور علی بن ابی طالب کو یمن، اور دیگر صحابہ کو دوسرے شہروں میں دعوت کے لئے بھیجا۔

رسول اللہ ﷺ نے جن صحابہ کو سفارت کے لئے منتخب فرمایا ان کے اندر سفارت کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے، ان کے اندر جہاں ایمانی قوت پوری طرح موجود تھی وہیں ان میں مواصلات کی مہارت بھی پائی جاتی تھی، تاکہ موثر انداز اور اطمینان بخش انداز میں اپنی بات پہونچا سکیں۔ (مہارات الاتصال، ص: ۷۹)

ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب لکھتے ہیں ان سفراء کے اندر وہ تمام صفات موجود تھے جو ذرائع ابلاغ سے متعلق افراد میں ہونی چاہیے:

وقد كانت رسله وبعوثه ﷺ وولاته خير من يحمل الرسالة ويودى الامانة ويقوم بالدور الاعلامي المناسب لذلك كله، ويجمع خصائص الاعلام الاسلامي التي اسلفناذكرها من امانة النقل وصدق الحديث والنزاهة والموضوعية۔ (اضواء على الاعلام فى صدر الاسلام، از ڈاکٹر محمد عجاج الخطيب، ص: ۴۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام سفراء اور گورنر پیغام رسانی اور امانت کی ادائیگی کے لئے سب سے موزوں تھے، اور ان تمام معاملات میں ان حضرات نے اعلام کے کردار کو بحسن وخوبی انجام دیا، یہ حضرات اعلام کی تمام صفات سے متصف تھے، یعنی امانت داری، سچائی، تقوی وطہارت اور علمی لیاقت ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ان سفراء کے صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار الوکیل لکھتے ہیں:

وقد كان جميع السفراء من الشباب الذين يتحلون بالسجايا الكريمة والخصال الشريفة وجمال الصورة ونقاء السريرة فضلا عن توقد الذكاء واللماحية الشفافة والبدية الحاضرة والحجة الباهرة۔ (سفراء النبي وكتابه ورسائله، دكتور مختار الوكيل، ص: ۵۰)

تمام سفراء ایسے نوجوان تھے جو اعلی اخلاق وعادات، خوبصورت، اور خوب سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہانت، برجستگی، حاضر جوابی، اور مضبوط دلائل کے ساتھ بات کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مکالمہ (حوار) کے ذریعہ ابلاغ

مختلف افراد کے درمیان مکالمہ ابلاغ کا اہم ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے، دوسرے فرد کو مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کا یہ ایماندانہ ذریعہ ہے، مکالمہ کی صورت میں دوسرا فریق جہاں توجہ سے بات سنتا ہے وہیں ان کی ذہنی ونفسیاتی الجھن بھی دور ہوجاتی ہے، اس طرح دعوت کا مقصد آسانی سے حاصل ہوجاتا ہے، مکالمہ کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے راشد علی عیسی لکھتے ہیں:

اذا ساد الحوار القائم على احترام راى الآخر سادت المودة مع اختلاف الراى، ذلک ان الحوار يعطى للنفس فرصة بث همومها والكشف عن اشكالياتها ومكامنها المعتمة ويفيد من ذلك الكشف كل من المتحاورين معا۔ (مهارات الاتصال، راشد علی عيسى، ص: ۴۹)

جب ایک دوسرے کی رائے کے احترام کے ساتھ تبادلہ خیال ہوگا تو اختلاف رائے باوجود محبت ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ تبادلہ خیال ایک دوسرے کے مسائل حل کرنے، اشکالات دور کرنے، اور رموز واسرار کو واضح کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، اور اس تبادلہ خیال سے مجلس کے ہر شریک ہو فائدہ پہونچتا ہے۔

عام لوگوں سے رابطہ قائم کرنے اور صحابہ سے تعلق استوار رکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مواقع پر

اس مکالمے کے طریقہ کو اختیار فرمایا، احادیث اور سیرت کی کتابوں میں اس کے بے شمار نمونے موجود ہیں، ان نمونوں سے کامیاب مکالمہ کے اصول وآداب آسانی کے ساتھ مستنبط کئے جا سکتے ہیں، ابوالولید عتبہ بن ربیعہ سے مکالمہ، ثمامہ بن اثال کے ساتھ مکالمہ، سہیل بن عمرو سے مکالمہ، اس کے بہترین نمونے ہیں۔

حج کے لئے آنے والے وفود سے ملاقات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے لئے آنے والے وفود سے ملتے، مکی دور میں ان سے خفیہ ملاقاتیں ہوتیں، کسی بھی تحریک ودعوت کے لئے ابتدائی مرحلہ میں یہ بہترین طریقہ ہوتا ہے کہ اپنی دعوت کے لئے فضا کو سازگار کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور اس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

مدنی دور میں جزیرہ عرب کے ہر گوشے سے وفود کی آمد ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا استقبال کرتے، ان کا اکرام کرتے، انہیں دین کی باتیں سمجھاتے، انہی وفود میں ایک وفد ضمام بن ثعلبہ کا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین کی باتیں سیکھ کر جب یہ لوگ اپنے قبیلہ پہونچے تو انہیں دین کی دعوت دی، اور اس طرح پورا قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، اسی طرح وفد عبدالقیس، وفد بنی حنیفہ اور دیگر وفود کا تذکرہ ملتا ہے۔

حجۃ الوداع

ابلاغی نظریہ سے دیکھا جائے تو حج بہت بڑا اور موثر ابلاغی وسیلہ کی شکل میں نظر آئے گا، اور رسول اللہ کا حج جسے حجۃ الوداع کے نام سے جانا ہے، وہ اس حوالے سے ایک عدیم المثال ابلاغی کردار ہے جس کے اثرات اس دور میں اور اس کے بعد بھی محسوس کئے گئے، اس موقع پر موجود جم غفیر کے سامنے دین کی حقانیت کو پیش کرنے کا بہترین موقع تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استعمال فرمایا۔ ڈاکٹر محمد عجاج خطیب اس موقع کی ابلاغی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

لقد کان لاجتماع المسلمین فی موسم الحج بھذا العدد الجم الغفیر اثر اعلامی کبیر فی بیان احکام الشریعہ عامة، و احکام الحج خاصة، و نشر ذلک کله فی الجزیرة العربیة ثم نقله بعد ذلک خارج الجزیرة العربیة، بل الی مختلف الآفاق حین انطلق ائمة الصحابه و التابعین و من جاء بعدهم یخرجون الناس من الظلمات الی النور و من الجاهلیة الی الاسلام، لقد کان حج الرسول مناسبة اعلامیة عظیمة، بلغ فیه الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الامانة و ادی الرسالة، و شارک فی هذه المناسبة مشارکة عملیة جماهیر المسلمین بنقل ما سمعوه و رائوه و فعلوه الی اهلیهم و ذویهم و من ورائهم۔ (اضواء علی الاعلام فی صدر الاسلام، ص: ۶۰)

حج کے موقع پر مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع شریعت کے احکام کی نشر واشاعت میں اور خاص طور پر حج کے احکام کی تبلیغ میں بہت زیادہ ابلاغی اثر رکھتا تھا، ساتھ ہی یہ اجتماع جزیرہ عرب کے اندرون، جزیرہ عرب کے باہر بلکہ آفاق

عالم میں احکام شریعت کی نشر و اشاعت کا اہم وسیلہ تھا، خصوصا جب صحابہ کرام، تابعین عظام اور اسلاف امت لوگوں کو تاریکی سے نور کی طرف اور جہالت سے اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے نکل پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حج بھی بہت بڑا ابلاغی وسیلہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت تک امانت پہونچادی، اور رسالت کا حق ادا کر دیا، اس موقع پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس طور سے عملی طور پر شریک ہوئی کہ جو سنا، دیکھا اور عمل کیا انہیں اپنے اہل وعیال، اعزہ واقارب اور آئندہ آنے والی نسلوں تک بعینہ منتقل کر دیا۔

خطوط کے ذریعے ابلاغ

عہد رسالت میں جزیرہ عرب کے اطراف میں بہت سی ریاستیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں اور مختلف قبائل کے سرداروں کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے، یہ خطوط جہاں عرب کے قریب موجود حکمران جیسے قیصر وکسری اور نجاشی کے نام تھے وہیں شاہ چین کے نام بھی دعوتی مکتوب بھیجا، آپ کی ان کوششوں سے جزیرۃ العرب کے متعدد قبائل نے اسلام قبول کیا، حبش کے بادشاہ نجاشی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

فعن انس ان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتب الی کسری و الی قیصر و الی النجاشی و الی کل جبار یدعوھم الی اللہ تعالی، ولیس بالنجاشی الذی صلی علیہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (صحیح مسلم ، کتاب الجھاد والسیر، باب کتب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی ملوک الکفار یدعوھم الی اللہ عز و جل، حدیث نمبر: ۴۷۰۹)

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسری، قیصر، نجاشی، اور سارے سرکش ومتکبر بادشاہوں کو اللہ کی طرف سے دعوت دیتے ہوئے خطوط لکھ کر بھیجے، اس نجاشی سے وہ نجاشی مراد نہیں ہے کہ جن کے انتقال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی۔

اس سلسلہ میں آٹھ خطوط کا تذکرہ سیرت کی عام کتابوں میں موجود ہے جو اس طرح ہے:

۱۔ اصحمہ نجاشی (شاہ حبش)، سفیر: حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ

۲۔ ہرقل (قیصر روم)، سفیر: حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ

۳۔ خسرو پرویز (کسری عجم)، سفیر: حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ

۴۔ جریج بن متی مقوقس (عزیز مصر) سفیر: حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ

۵۔ حارث بن ابی شمر غسانی (شاہ دمشق)، سفیر: حضرت شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ

۶۔ ہوزہ بن علی حنفی (والی یمامہ) سفیر؛ حضرت سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ

۷۔ جیفر، عبد (شاہان عمان) سفیر: حضرت عمرو عاص سہمی رضی اللہ عنہ

۸۔ منذر بن ساوی العبدی (ملک بحرین) سفیر: علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ

(سیرۃ النبی، ابن ہشام، ج ۴، ص: ۲۷۸)

بعض مورخین کے نزدیک ان خطوط کی تعداد ۲۵۰ کے قریب ہے۔(ان خطوط کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: نقوش رسول نمبر، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ج ۲، ص: ۲۶۶)

عہد رسالت میں میڈیا وار

عہد رسالت میں مذکورہ بالا شکلوں کے علاوہ بھی ابلاغ کے متعدد کردار ہمیں نظر آتے ہیں، بلکہ ابلاغ کے ساتھ پروپیگنڈہ اور پروپیگنڈوں کا جواب بھی بہت نمایاں شکل میں نظر آتا ہے میڈیا وار کے بارے میں لیاقت علی خان لکھتے ہیں:

میڈیا وار کے نام سے جو تذکرہ گرم ہے یہ کوئی نئی جنگ نہیں ہے، انسانی معاشرہ کی اس سے پرانی شناسائی ہے، میسر وسائل کی مدد سے ہر دور میں اس جنگ نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے، میڈیا وار ہر اس وسیلے کو کہا جاتا ہے جس کی مدد سے اپنے نظریات دوسروں تک منتقل کی جاسکیں، قبائلی دور میں یہ جنگ شعروشاعری اور فصاحت وبلاغت کے زور پر لڑی جاتی تھی، اور اس میں اہم کردار شعر کا ہوتا تھا۔(اسلام کا قانون صحافت، ص: ۱۱۲، از لیاقت علی خان نیازی، ط: بک ٹاک لاہور ۲۰۰۸ء)

عہد نبوی کے میڈیا وار کی مزید وضاحت کرتے ہوئے محمد انور لکھتے ہیں:

مدح وتعریف اور مذمت وہجو کلام عرب کے معروف اصناف سخن ہیں، جنہیں دور قدیم کی میڈیا وار کا سب سے اہم عنصر قرار دیا جاسکتا ہے، پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ میڈیا وار کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنے دور کے محدود وسائل کو استعمال میں لاکر موقع محل کے اعتبار سے بھرپور انداز میں دشمن اسلام کے خلاف یہ ہتھیار استعمال فرمایا ہے۔(عالم اسلام پر یہود ونصاری کے ذرائع ابلاغ کی یلغار، ص: ۶۲، از محمد انور بن اختر، ط: ادارہ اشاعت اسلامی کراچی، ۲۰۰۳ء)

سیرت نبوی کے مطالعہ سے ابلاغ کی اہمیت، اور عہد نبوی میں ذرائع ابلاغ کے غیر معمولی کردار کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ابلاغی پروپیگنڈہ، اوران پروپیگنڈوں کا جواب، اور نفسیاتی جنگ کی تدابیر کے متعدد نمونے بھی سامنے آتے ہیں، عہد نبوی کے کامیاب ترین ابلاغی کرداروں کی تفصیلات سے یہ پیغام ملتا ہے کہ مسلمانوں کے ابلاغی وسائل کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں زیادہ متحرک ہونے کی ضرورت ہے، دین کی حقانیت کو پوری دنیا تک پہونچانے کے لئے، اسلامی تعلیمات سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے اور مسلمانوں کی اجتماعی شبیہ کو بہتر بنانے کے لئے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنا مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے، اسی طرح اسلامی تعلیمات میں ایسی بے شمار ہدایات موجود ہیں جن کی روشنی میں ہر دور کے میڈیا کے لئے رہنما اصول وضع کئے جاسکتے ہیں، بلکہ ان خطوط پر میڈیائی ذرائع کی تشکیل کی جاسکتی ہیں، اور اس کے عملی نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ

ایک معروضی مطالعہ

مولانا ڈاکٹر محمد اعظم ندوی
(استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ (۱۹۰۸ء-۲۰۰۲ء) نے تالیف وتصنیف کے میدان میں نئی نئی جہتیں نکالی ہیں، وہ پامال راہوں پر کم چلے ہیں، ان کے قلم تحقیق رقم سے نادر موضوعات پر بیش قیمت اور ٹھوس علمی کام منظر عام پر آتے رہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بافیض بنایا، ان کے بہت سے کاموں نے مرجع کی حیثیت حاصل کی، چنانچہ ان کی تحقیقات کو کسی تعارفی مقدمہ یا تقریظ کی ضرورت نہیں پڑی، ان کا کام خود بولتا ہے، اور ذوق تحقیق رکھنے والے طالب علموں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس سے استفادہ کریں، شاید یہ ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے، انہیں نوادرات علمی میں ایک کتاب "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ" ہے، جس میں ۶۳۶ دستاویزات ہیں، اگرچہ نمبر شمار کے اعتبار سے کتاب میں ۳۷۳ ہی ہے، لیکن کئی دستاویزات میں ایسا ہوا ہے کہ بعد کے ایڈیشن میں سابقہ نمبر کو باقی رکھتے ہوئے الف، ب، ج لکھ کر کسی اضافی فائدہ کی بنیاد پر مکرر یا تین چار طریقہ سے بھی ایک ہی تحریر کو نقل گیا ہے، اس طرح ان کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے، یہ دستاویزات درج ذیل ۷ موضوعات سے متعلق ہیں:

۱۔ معاہدات یا معاہدات کی تجدید

۲ دعوت اسلام۔

۳۔ عمال کے تقررات اور ان کے فرائض۔

۴۔ اراضیات اور ان کی اجناس وغیرہ کے بخشش نامے۔

۵۔ صلح وامان اور وصیت۔

۶۔ چند خاص لوگوں کے حق میں کچھ مخصوص معاملات میں گنجائش پر مشتمل تحریریں۔

۷۔ متفرقات جن میں بعض وہ خطوط بھی ہیں جو مکاتیب نبوی کے جواب میں آئے۔

کتاب کے ایڈیشن

میرے زیر نظر کتاب کے اصل عربی نسخہ کا چھٹا ایڈیشن ہے، جس کا سن طباعت ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء ہے، اور یہ درمیانی سائز کے ۷۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دار النفائس، بیروت، لبنان سے چھپا ہے، اس سے پہلے بھی اس کے دو ایڈیشن، طبع چہارم ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اور طبع پنجم ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں اسی کتاب گھر سے شائع ہوئے ہیں، اور اس کے بعد اس کا ساتواں ایڈیشن بھی یہیں سے ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے، اور اس پر پہلی بار بین الاقوامی معیاری کتابی عدد (ISBN) بھی لکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے: (ISBN 9953-18-038-5)، جبکہ یہ پہلی بار عربی زبان میں لجنۃ التالیف والترجمہ، قاہرہ، مصر سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا، اور دوسری بار بھی ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں یہیں سے چھپا، تیسرا ایڈیشن دار الارشاد، بیروت سے ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا، پھر مسلسل چار ایڈیشن دار النفائس سے آچکے ہیں جیسا کہ ابھی ذکر آیا۔

فرانسیسی اور اردو ترجمے

ان دستاویزات کا فرانسیسی ترجمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے خود شائع کیا، جس کے ساتھ ان کی تاریخی حیثیت پر سیر حاصل بحث کی، جس کا عنوان تھا: Documents sur la diplomatic musulmane a l`epoque du Prophete des khalifes orthodoxes، جس پر انہیں ۱۳۵۳-۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی آف پیرس سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی، جو اسی سال Maisonneuve پیرس سے شائع ہوئی (مجموعۃ الوثائق: ص ۲۶)، عربی میں تو اس کا اصل مسودہ تھا ہی، اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین، معاہدات، مکاتیب اور خلفاء راشدین کے احکام: سیاسی وثیقہ جات از عہد نبوی تا بہ خلافت راشدہ“ کے عنوان سے شائع ہوا، جس کے مترجم مولانا ابویحیی امام خاں نوشہروی ہیں، مترجم کے مقدمہ پر ۱۲/اپریل ۱۹۶۰ء کی تاریخ درج ہے، شاید پہلی بار اسی سال چھپی ہو، میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن دیکھا ہے جو حکومت پنجاب کے محکمۂ اطلاعات کے تعاون سے ۲۰۰۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۳۳۰ صفحات میں شائع ہوا ہے۔

کتاب کے مندرجات

طبع ششم پہ پانچ مقدمات خود ڈاکٹر صاحب کے قلم سے موجود ہیں، چھٹے ایڈیشن کا کوئی اضافی مقدمہ نہیں، تیسرے مقدمہ پر رجب ۱۳۸۷ھ کی تاریخ درج ہے، چوتھے پر ۵ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ، پانچویں پر یوم میلاد النبی ۱۴۰۵ھ کی تاریخیں درج ہیں، یہ تینوں مقدمے پیرس میں لکھے گئے ہیں، پہلے اور دوسرے مقدمات پر تاریخیں موجود

نہیں ہیں، البتہ پہلے مقدمہ پر نام کے ساتھ مقام جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن کا ذکر ہے۔

ان مقدمات کے بعد ایک صفحہ میں کتاب میں استعمال ہونے والے رموز و اشارات کی وضاحت کی گئی ہے، جیسے ''بث'' سے مراد ابن اثیر کی ''اسد الغابة''، ''بج'' سے مراد ابن حجر کی ''الاصابة''، ''طب'' سے ''تاریخ طبری''، ''قلقش'' سے ''قلقشندی''، ''س'' سے ''سطر''، ''ص'' سے ''صفحہ اور ''انظر'' سے جدید تحقیقات کی طرف اشارہ وغیرہ۔ اس کے بعد تین صفحات میں عربی مجموعہ اور اس کے فرانسیسی ترجمہ میں دستاویزات کے نمبرات میں جو فرق ہے اس کی فہرست دی گئی ہے۔

کتاب میں چار ابواب ہیں، جو ''القسم'' کے عنوان سے ہیں، پہلی قسم میں وہ دستاویزات ہیں جو ہجرت سے پہلے کی ہیں، جو کتاب کے بارہ صفحات پر مشتمل ہیں، سب سے پہلے خط کا عنوان ''الی النجاشی فی شان مهاجری الحبشه'' ہے، یعنی مہاجرین حبشہ کے سلسلہ میں نجاشی کو لکھا گیا مکتوب نبوی ہے، اس کے علاوہ اور ۸/ دستاویزات ہیں، گویا ان کی مجموعی تعداد ۹ ہے، جن میں وہ تحریر بھی ہے جو قریش نے بنو ہاشم کے بائیکاٹ کے لیے لکھی تھی، اور بیعت عقبۂ اولی، ثانیہ اور ثالثہ کے مواقع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی گئی زبانی ہدایات کو بھی دستاویزی شکل میں لکھ دیا گیا ہے، چونکہ یہ بھی ایک طرح کا معاہدہ اور آئندہ قائم ہونے والی اسلامی حکومت کی تیاری سے متعلق تھیں۔

دوسری قسم ہجرت کے بعد کی دستاویزات سے متعلق ہے، جس میں ۳۶۸ دستاویزات ہیں، جن میں میثاق مدینہ کے علاوہ ارتداد سے متعلق تحریریں، یہود مدینہ، روم و ایران، ان کی ذیلی حکومتوں اور مختلف عرب قبائل سے ہونے والے معاہدات کی دستاویزات یا ان سے متعلق مکاتیب نبوی شامل ہیں، قابل ذکر ہے کہ اس باب میں خطبۂ حجۃ الوداع کو دستاویزی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے چونکہ وہ بھی انسانی حقوق کا چارٹر کہلاتا ہے، اور دفعہ وار ان کا معرض تحریر میں آنا ضروری تھا، گویا اپنی اصل کے اعتبار سے وہ خطبہ ہے تحریر نہیں۔

تیسری قسم خلافت راشدہ سے متعلق ہے، جس میں صفحہ ۳۶۹ سے ۵۴۴ تک خلفاء راشدین کے خطوط، فرامین اور دیگر دستاویزات کے علاوہ حضرت معاویہؓ کا بھی ایک خط ہے جو انہوں نے امیر شام کی حیثیت سے قیصر روم کو صفین کے زمانہ میں تحریر فرمایا تھا، اسی طرح خلفاء راشدین سے مراسلت کے ضمن میں دیگر صحابۂ کرامؓ کے خطوط بھی اس باب میں نقل کئے گئے ہیں، ان دستاویزات کی مجموعی تعداد ۲۳۳ ہے۔

چوتھی قسم مختلف ضمیموں پر مشتمل ہے، جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے فرزند کے انتقال پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تعزیتی تحریر کے علاوہ یہود و نصاری اور مجوسیوں کے ساتھ کئے گئے ان نبوی معاہدات کا ذکر ہے جن کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مصنف کے نزدیک یقینی نہیں، تاہم چونکہ ان کی نسبت ذات نبوی کی طرف کی جاتی ہے اس

لیے ان پر تنقید وتبصرہ اوران کے جعلی ہونے کی صراحت کے لیے "ذکر ما نسب الی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔۔" کے عنوان سے ذکر کر دیا گیا ہے، (مجموعة الوثائق: ص ۲۸) پہلا ضمیمہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مجوسی رشتہ داروں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لکھے گئے ایک عہدنامہ سے متعلق ہے، دوسرا ضمیمہ یہودیوں اور تیسرا عیسائیوں سے معاہدات پر مشتمل ہے، جو نبی آخرالزماں کی طرف سے منسوب ہے، ایک عہدنامہ آرمینیا کے عیسائیوں کے لیے بھی ترکی ترجمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اور کاتب حضرت معاویہؓ ہیں، اس پر ڈاکٹر صاحب نے یہ تنقید کی ہے کہ آرمینیا ۲ ھ میں فتح بھی نہیں ہوا تھا، اور دوسری تحریروں کو بھی موضوع بتایا ہے، ان ضمیموں کی تعداد ۱۰ ہے۔

اس کے بعد شرح الفاظ کے عنوان سے ص ۵۷۹ سے ۶۴۴ تک کتاب میں وارد ہونے والے کم وبیش ۵۰۰ الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے، جن میں بیشتر ابن منظور کی "لسان العرب" سے منقول ہیں، جیسا کہ مصنف نے خود صراحت کردی ہے (مجموعة الوثائق: ص ۵۷۹)۔

اس کے بعد تذکرة المصادر کے عنوان سے Bibliography دی گئی ہے، اس میں نمبر شمار موجود نہیں، ویسے تقریباً ۳۰۰ سے زائد مراجع کا ذکر آیا ہے، پھر اشخاص ومقامات وغیرہ کا اشاریہ ہے، پھر انساب کی بھی فہرست ہے جس میں صحابۂ کرامؓ اور بعض دیگر شخصیات کے قبائل کا تذکرہ ہے، پھر ایک اور ملحق (ضمیمہ) دیا گیا ہے جس میں چوتھے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر پانچویں ایڈیشن میں جو تصحیحات، اضافے اور استدراکات کئے گئے ہیں ان کو نقل کیا گیا ہے، اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ کتاب کے اصل متن کو چھیڑے بغیر صفحہ اور سطر نمبر دے کر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ مندرجات میں کہاں کیا اضافہ یا تصحیح کر کے پڑھنا ہے،، اس میں ضمناً ۲۶ دستاویزات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔

فہرست کتاب کے اخیر میں کتاب میں آنے والے نقشوں کی بھی فہرست ہے، جن کی تعداد ۹ ہے، اور ایک ورق کو کتاب کی پشت کے اندرونی حصہ سے ملحق کیا گیا جس میں عرب عاربہ (قحطانی یمنی) اور عرب مستعربہ (عدنانی حجازی) دونوں سے متعلق قبائل کا شجرہ دیا گیا ہے۔ نجاشی، ہرقل، مقوقس، کسری اور منذر بن ساوی اسی طرح جلندی کے دو بیٹے شاہ عمان جیفر اور اس کے بھائی عبد کے نام مکاتیب نبوی کی اصل کاپی کے فوٹو مختلف النوع ذرائع سے حاصل کر کے ان کے فوٹو ثبت کئے ہیں، جو کتاب میں ان کے متعلقہ مقامات پر دیکھے جاسکتے ہیں، اور اس میں مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

اس تالیف کا محرک:

پہلے ایڈیشن کے مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف کا اصل محرک مؤلف کا یہ ایقان تھا کہ عہد نبوی دنیا کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی تاریخ میں انتہائی دوررس نتائج کا حامل رہا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ کسی عہد کے سیاسی حالات کما حقہ سمجھے جاسکیں جب تک کہ اس دور کی سرکاری دستاویزات کا مطالعہ نہ کیا جائے، اسلام سے پہلے عربوں کی

کوئی منظم حکومت نہ تھی، جبکہ اسلام نے بڑی تیز رفتاری سے دور دراز علاقوں کو اپنے زیر نگیں کرلیا، اور یہ کام وہ بھی منظم طور پر بین قومی تعلقات کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور ایسے وسیع تعلقات بغیر خط وکتابت اور معاہدات وغیرہ کے نہیں ہوتے، اور اس کی واقعاتی شہادت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس صندوق بھر عہد ناموں کے نسخے تھے، جو ۸۲ھ میں جماجم کی جنگ کے موقع سے خاکستر ہوگئے، اور جو بچے وہ زمانہ کی دستبرد اور تاتاریوں کی یورش کی نذر ہوگئے، اس لیے مقوقس، منذر بن ساوی اور نجاشی کو لکھے گئے مکاتیب نبوی کو چھوڑ کر جن کی اصل کی دریافت مستشرقین نے کی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور خطوط کی اصل نہیں ملتی، لیکن حدیث وتاریخ کے راویوں نے ان کے تذکرے اپنے واسطوں سے ہمارے لیے محفوظ کردیے ہیں، اس لیے ان کا جمع کرنا اور ان کے صحت وسقم پر بحث کرنا ایک اہم کام ہے (مجموعۃ الوثائق: ص ۲۴)۔

مصادر ومراجع

مؤلف کے مراجع میں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ۳۰۰ سے زیادہ کتابیں، رسائل اور دستاویزات ہیں، جن میں عربی، اردو، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، ولندیزی (Dutch) ۹ رزبانوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر زبانوں کی مطبوعات ومخطوطات دونوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تاہم مؤلف نے نبوی دستاویزات کے لیے سب سے زیادہ اعتماد **"طبقات ابن سعد"** پر کیا ہے، جبکہ خلفاء راشدین کی دستاویزات کے لیے بلاذری کی **"فتوح البلدان"** سے زیادہ مراجعت کی ہے، اسی طرح ابو عبید قاسم بن سلاّم کی مشہور کتاب **"کتاب الاموال"**، امام ابو یوسف کی **"کتاب الخراج"** اور **"سیرت ابن ھشام"** بھی اس کتاب کے بنیادی مراجع میں شامل ہیں۔ شیخ ابن طولون کی **"اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین"**، عبدالمنعم خاں کی **"رسالات نبویۃ"** اور عبدالجلیل نعمانی کی **"فرمان نبوت"** کو بھی مؤلف نے اپنے اہم مراجع میں شمار کیا ہے، کئی مراجع کا تذکرہ مراجع کی فہرست میں نہیں آسکا ہے، جیسے حافظ ابن حجر کی **"المطالب العالیہ"**، جبکہ متعلقہ مقام پر اس کا ذکر ہے۔

قابل ذکر ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے علاوہ مستشرقین اور دیگر مصنفین سے بھی خوب استفادہ کیا ہے، حتی کہ انہوں نے مجوسیوں سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ایک مکتوب مشہور مجوسی شخصیت جمشید جی جیجی بھائی نیت (Sir Jamshedji Jeejiboy Knight) سے بھی نقل کیا ہے، اگرچہ اس کے استناد پر تنقید کی ہے۔

کتاب کا منہج اور معیار صحت

یہ کتاب اگرچہ اپنے موضوع پر اساسی مرجع کی حیثیت اختیار کرچکی ہے، لیکن کتاب میں بہت سی ضروری تحریریں نہیں آسکی ہیں، جیسے خلفاء راشدین کے زمانہ کی فتوحات سے متعلق دستاویزات کا استیعاب نہیں ہوسکا ہے،

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے بجائے اس کے کہ دستاویزات کی صحت کے لئے محدثین کے طریقہ پر ان کے راویوں کی عدالت وضبط اور اتصال سند کو بنیاد بنائیں، انہوں نے اسلوب کو بنیاد بنایا ہے کہ اگر صنعت وتکلف سے آزاد ہے تو صحیح ہونے کا مکان ہے، تکلف وصنعت ہے تو بعد کی ایجاد ہے، جبکہ انہوں نے بعض دستاویزات ابن درید کی ”الاشتقاق“، ابن سیدہ کی ”المحكم“ اور ابن منظور کی ”لسان العرب“ وغیرہ سے بھی نقل کر دی ہیں، اور اہل علم ان کے درجۂ صحت سے واقف ہیں۔

بعض نمایاں خصوصیات

ا۔ یہ کتاب علم وثائق (Diplomatics) میں گرانقدر اضافہ ہے جس میں تاریخی دستاویزات کی جمع وترتیب اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے، عہد رسالت یا ابتدائی مسلم عہد حکمرانی کی دستاویزات سے متعلق اس کتاب سے پہلے اور بھی کتابیں آئی ہیں، جیسا کہ خود اس کتاب کے مراجع سے بھی ظاہر ہے، اور بعد میں بھی کافی کام ہوا، لائبریری سائنس کے ماہر ڈاکٹر محمد ماہر حمادہ اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتے ہیں، انہوں نے ”الوثائق السياسية والادارية“ کے عنوان سے اس موضوع پر ۶ یا ۷ کتابیں لکھی ہیں، عہد اموی، عباسی، مملوک سلطنت، فاطمی اور ایوبی دور، دور اندلس وشمالی افریقہ کی سیاسی دستاویزات کا احاطہ کیا ہے، اور دور حکومت کی مناسبت سے اس نام کے ساتھ ایک لاحقہ لگایا ہے، جیسے عصر اموی کے لیے ”الوثائق السياسية والادارية العائدة للعصر الاموى“ اور عہد عباسی کے لیے ’الوثائق السياسية والادارية العائدة للعصر العباسى“ وغیرہ، اور یہ کتابیں مؤسسة الرسالہ، بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔

اسی طرح قاضی اور مؤرخ شیخ محمد بن علی اکوع حوالی (۱۹۔۱۴۲۱-۱۳۲۱ھ) نے ”الوثائق السياسية اليمنية من قبيل الاسلام الى ۳۳۲ھ“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ۱۸۰ خطوط جمع کئے ہیں جو آپ نے یمن کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں کے نام تحریر فرمائے ہیں، ان کے علاوہ خلافت راشدہ، عہد اموی اور عہد عباسی اور ماقبل اسلام کے بھی سینکڑوں دستاویزات اس میں شامل ہیں جو یمن کے حکمرانوں کو مختلف حکومتوں کی جانب سے لکھے گئے، ۳۱۷ صفحات کی یہ ضخیم کتاب دار الحرية للطباعہ، بغداد سے ۱۹۷۶ء میں چھپی ہے، اور یہ کتاب بھی ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مراجع میں شامل ہے، لیکن مراجع اور ان کی زبانوں کی کثرت نیز دستاویزات کے تنوع کے اعتبار سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کام سب پر حاوی ہے۔

۲۔ اس کتاب میں زبان وبیان اور اسلوب بھی ڈاکٹر صاحب کا بہت کچھ اپنا ایجاد کردہ ہے، عربی زبان عجمی اثرات سے محفوظ نہیں، اردو زبان کے لیے وہ ”اللغة الهندوستانية“، فرانسیسی زبان کے لیے ”اللغة الفرنساوية“ (ص:۳۷) اور انگریزی زبان کے لیے ”اللغة الافرنجية“ (ص:۳۷) لکھتے ہیں جبکہ بالترتیب

ان کے لیے ”اللغة الاردیة“ ، ”اللغة الفرنسیة“ اور ”اللغة الانجلیزیة“ لکھا جاتا ہے، عیسوی کے لیے ”میلادیة“ لکھا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب ”مسیحیة“ لکھتے ہیں۔

۳۔ایسی اہم کتاب کی تالیف اور اس کے لیے بے نظیر قربانیوں اور جانفشانیوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے انداز میں کہیں تعلّی یا دعوی کا شائبہ نہیں ملتا، اس کے برعکس ہر ایڈیشن میں سابقہ غلطیوں کا اعتراف، اور ارباب فکر و نظر سے اغلاط کی تصحیح کی درخواست کرتے ہیں، مثلاً انہوں نے کوہ سلع مدینہ منورہ سے غزوۂ خندق کے زمانہ میں حضرت علیؓ کے دست مبارک کی کندہ کی ہوئی ایک تحریر کا فوٹو نقل کیا تھا (ص: ۳۲) اور دستاویز نمبر ۳۰۲ میں کوہ سلع سے ہی حضرت عمرؓ کے خط خاص میں لکھا ہوا ان کے نام کا فوٹو نقل کیا ہے، جس کی بیان کردہ سابقہ تفصیلات کی صحت سے تیسرے ایڈیشن کے حاشیہ میں معذرت کا اظہار کیا ہے (ص: ۳۵)۔

۴۔اور کتاب کی تالیف میں جن لوگوں سے بھی مدد ملی ہے اس کا کھلے دل سے اعتراف اور احسان شناسی کا اظہار کیا ہے، جیسے ڈاکٹر محمد مصطفی اعظمی کی کتاب ”کُتّاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ سے استفادہ کی صراحت اور مصنف کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں، ترکی محقق جناب احسان ثریا صیرما کا بھی خوب شکریہ ادا کرتے ہیں، صرف ایک خط پر روسی مصنف علی کولیسنیکوف کے بھی شکر گذار ہوتے ہیں (ص: ۱۱)۔

اس کتاب کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، اسلامی سیاست و حکومت اور اسلام کے بین الاقوامی تعلقات وغیرہ پر جتنی تحقیقی کتابیں عالم عرب یا یورپ وغیرہ میں لکھی جارہی ہیں ان میں اس کا حوالہ ضرور ملتا ہے، یہ اس کے عنداللہ اور عندالناس مقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کی علمی خدمات

محمد مرغوب الرحمٰن ندوی
(باحث مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۶۳ میں اپنے چند بلند پایہ معاصرین کے مشورے کے بعد مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی، اس وقت اس ادارے کا بنیادی مقصد نئے مسائل پر شرعی نقطہ نظر سے اجتماعی غور وخوض کے بعد کسی حتمی فیصلے تک پہنچنا یا کم ازکم نئے پیش آمدہ مسائل میں فقہ اسلامی کی مسلمہ اور وسیع حدود کی پابندی کرتے ہوئے غور وفکر کے بعد آسانیاں پیدا کرنا تھا، بعد میں اس کے مقاصد میں توسیع ہوئی، ان میں ایک اہم مقصد علمی و تحقیقی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہے، اس مقصد کے مدنظر اب تک مجلس کی مطبوعات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہو چکی ہے، اس وقت برائے تعارف مجلس کی مطبوعات میرے پیش نظر ہیں، مجلس کی مطبوعات کئی نوعیتوں کی ہیں، ان میں اکثر مطبوعات مجلس کے تحت ہونے والی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، کچھ مطبوعات مجلس کی تاریخ اور اس کے علمی منہج سے متعلق ہے اور چند مطبوعات مجلس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر مجلس سے تصحیح و نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے مجلس کے تحت ہونے والی سرگرمیوں پر مشتمل مطبوعات کا تعارف پیش خدمت ہے:

* انشورنس (مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ: ۱۹۶۵)

ملک کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن نازک اور خطرناک حالات سے گزر رہے تھے، ان میں سے ایک مسلمانوں کی جان و مال وغیرہ کے تحفظ کا مسئلہ تھا، علماء، اصحاب افتاء اور اہل فکر و دانش اس سلسلے میں فکرمند اور بے چین تھے، اس لیے مجلس نے ۱۹۶۵ میں انشورنس کے موضوع پر اجتماعی مذاکرہ کے ذریعے ایک قول فیصل تک پہنچنے کا ارادہ کیا، تاکہ مسلم عوام اس سے واقف ہو کر عمل کرسکیں، مجلس نے اس موضوع پر سوال نامہ تیار کرکے علمائے کرام اور اصحاب افتاء کی خدمت میں بھیجا، متعدد حضرات نے مقالات اور مکتوبات کی شکل میں اپنے جوابات اور اپنے موقف کا اظہار کیا، پھر ۱۵ / ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ کو مجلس نے اجلاس بلایا، آئی ہوئی تحریروں اور فتاوی کی روشنی میں موضوع پر تبادلۂ خیال کے بعد مجلس نے ضرورت شدیدہ کی بنا پر انشورنس کرانے کی تجویز پاس کی۔

یہ کتاب انھیں مقالات و مکتوبات، فتاوی اور تجویز کا مجموعہ ہے، جسے استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء مفتی مسعود حسن حسنی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) کی ترتیب و تحقیق کے بعد مجلس نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں سابق ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا مقدمہ ہے، پھر مولانا عتیق احمد بستوی (سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ) کا پیش لفظ اور عرض مرتب ہے، بعد ازاں مجلس کے ناظم اول مولانا تقی امینیؒ کی مختصر مگر معلومات افزا تحریر ''مسئلہ بیمہ: تاریخ و تعارف'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ کتاب کے آخر میں افادۂ عام کے لیے ادارہ مباحث فقہیہ اور اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا کے متعدد فیصلے انشورنس اور میڈیکل انشورنس سے متعلق درج ہیں۔

* **رویت ہلال اور اختلاف مطالع** (مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ: ۱۹۶۷)

ہر سال تین مرتبہ مسلمانوں کے سامنے ایک مسئلہ آتا تھا اور وہ تھا رویت ہلال کا مسئلہ، بعض اوقات تو اس سلسلے میں لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی تھی لیکن بعض مرتبہ اس سلسلے میں اختلاف و افتراق ہنگامے کا باعث ہو جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات تو باہمی نزاع کی شکل اختیار کر لیتا تھا، ایک شہر اور ایک گاؤں میں دو عیدیں ہو جاتی تھیں، بعض مرتبہ ایک گھر میں چند افراد آج عید منا رہے ہیں اور بقیہ کل، یہ صورتحال مسلمانوں کے لیے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مضر تھی، اس لیے مجلس کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ کا واضح طور پر ایسا فیصلہ سامنے آجائے جو شرعی نقطۂ نگاہ سے حق وصواب ہو، مجلس نے حضرات علماء اور ارباب افتاء کی خدمت میں موضوع سے متعلق سوال نامہ ارسال کیا، ۱۹۶۷ میں اس موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا اور تجاویز منظور کیں۔

زیر نظر رسالہ انھیں جید علماء اور ماہر فقہا کی گراں قدر تحریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے سیمینار کے لیے تحریر فرمایا تھا، اس مجموعے میں موضوع سے متعلق سوال نامہ اور تجاویز بھی ہیں، اس رسالے کی ترتیب و تحقیق استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ) نے کی ہے۔ رسالہ کے مقدمے اور پیش لفظ کے بعد عرض مرتب ہے، جس سے رویت ہلال اور اختلاف مطالع کے موضوع پر بنیادی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

رسالے کی ایک خاص بات جو مجھے نظر آئی اور پسند آئی وہ یہ ہے کہ موضوع سے متعلق جن حضرات کی تحریریں ہیں، مرتب نے ان کا اختصار کے ساتھ عمدہ انداز میں تعارف پیش کیا ہے، جس سے اہل علم و قلم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مگر فاضل مرتب نے تعارف میں مصادر و مراجع کا ذکر نہیں کیا ہے، اگر وہ بھی زینت قرطاس فرماتے تو شائقین سیرت و سوانح کے لیے زیادہ مفید اور باعث تسکین ہوتا۔

* **سرکاری قرضے** (مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ: ۱۹۷۱، ۲۰۲۲)

ضرورت مند افراد کو سود کے بغیر قرض فراہم کرنا بہت بڑا کار ثواب ہے، اسلام میں اس کی بڑی ترغیب دی گئی ہے اور ضرورت مندوں کو قرض دینے پر بڑے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، موجودہ دور میں قرض دینے کا عمل موقوف سا ہو

گیا ہے۔شاذ و نادر ہی ایسے لوگوں ہیں جن کے پاس زائد سرمایہ ہوتا ہے اور وہ ضرورت مندوں کو سود کی شرط کے بغیر قرض فراہم کرتے ہیں، مسلمانوں کو اس کار خیر کی طرف ترغیب دینا اور اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا بے حد ضروری ہے تا کہ ضرورت مند افراد سودی قرضے حاصل کرنے پر مجبور نہ ہوں، اور سودی قرضے حاصل کر کے اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور دین و ایمان کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ اگر سود کے بغیر قرض ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، لیکن اگر قرض میں (سرکاری ہو یا غیر سرکاری) سود شامل ہے، تو اس پر جواز اور عدم جواز کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

مسئلے کی اسی نزاکت و حساسیت کے مدنظر مجلس تحقیقات شرعیہ نے سودی قرضے پر ۱۹۷۱ میں اجتماع منعقد کیا تھا، اس موقع پر جاری کردہ سوال نامے کے جواب میں اس وقت کے ممتاز علماء اور ارباب افتاء نے جوابات تحریر فرمائے تھے، لیکن کسی وجہ سے اس مجلس میں فیصلہ نہ ہو سکا اور موخر ہو گیا، ۲۳، ۲۴ / نومبر ۲۰۲۲ کے سیمینار میں ۱۹۷۱ کے فقہی اجتماع میں آنے والی فتاوی اور تحریروں نیز ان تجاویز کو پیش نظر رکھا گیا، جو مذکورہ اجتماع میں شرکاء کے درمیان زیر بحث آئیں تھیں، ۲۰۲۲ کے فقہی سیمینار کے موقع پر اس موضوع سے متعلق جو نئے مقالات اور تحریریں موصول ہوئیں ان پر بھی غور وخوض کیا گیا، اس کے علاوہ ۱۹۷۱ سے لے کر ۲۰۲۲ تک سرکاری سودی قرضوں اور بینکوں کے سودی قرضوں کے بارے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان پر بھی فقہی سیمینار میں غور کیا گیا، ان سب کی روشنی میں تفصیلی غور و فکر اور تبادلۂ خیال کے بعد شرکائے سیمینار اس تجویز پر متفق ہوئے کہ ضرورت شدیدہ کے وقت بقدر ضرورت سودی قرضہ لینے کی گنجائش ہے۔

یہ کتاب سودی قرضے سے متعلق ۱۹۷۱ اور ۲۰۲۲ کے مقالات و تحریری آراء کا مجموعہ ہے، جس کی ترتیب و تحقیق کا کام استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مفتی رحمت اللہ ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ) نے انجام دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مجموعۂ مقالات ۲ / حصوں پر منقسم ہے، پہلے حصے کے ابتدا میں حرف چند طبع جدید از مرتب، مقدمہ از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، پیش لفظ از جناب مولانا عتیق احمد بستوی اور پھر عرض مرتب ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ کے مقتدر علماء اور بالغ نظر فقہاء کی تحریریں و مقالات ہیں، اسی طرح سودی قرضے سے متعلق آل انڈیا اسلامک فقہ اکیڈمی اور ادارہ مباحث فقہیہ کی تجاویز اور فیصلے ہیں، نیز تجویز متعلق منتقلی قبر حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ بھی شامل کتاب ہے، جو ۱۹۷۱ کے فقہی اجتماع میں پاس ہوئی تھی۔ حصہ دوم ۲۰۲۲ کے فقہی سیمینار کے موقع پر سودی قرض سے متعلق موصول ہونے والے چند مقالات اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں مجلس کی جانب سے پاس کردہ تجویز ہے۔ مرتب نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ ۱۹۷۱ کی تحریروں کے محررین کا مختصر سوانحی خاکہ مع مصادر و مراجع کے ذکر کیا ہے، جو یقینا قارئین کے لیے مفید ہوگا۔

مذکورہ تینوں مجموعۂ مقالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مقالات کی تبیض و تحقیق اور ترتیب و تعلیق کا

دشوار ترین کام تینوں فاضل مرتبین و محققین نے سعی پیہم اور جہدِ مسلسل کے ساتھ انجام دیا ہے، کیوں کہ ۲۰۲۲ کے مقالات کے علاوہ بقیہ مقالات پر پانچ دہائی کا عرصہ گزر چکا تھا، جس وجہ سے وہ بہت ہی بوسیدہ حالت میں تھے، لہذا اس پر جہاں ایک طرف مرتبین اپنی جانفشانی وجانکاہی کی بنا پر مبارکباد کے مستحق ہیں، وہیں دوسری طرف مجلس بھی لائق تحسین وستائش ہے کہ اس نے ان گراں قدر علمی وفقہی مقالات کی طباعت واشاعت کا فیصلہ کیا اور اس علمی وفقہی امانت کو جو فائلوں میں دب کر نا قابل استفادہ ہو رہی تھی، کتابی شکل میں شائع کر کے ضائع ہونے سے بچالیا اور اہل علم کے حوالے کر دیا۔

* کرونا سے متعلق اہم مباحث (مجموعہ مقالات فقہی سیمینار مجلس تحقیقات شرعیہ: نومبر ۲۰۲۲)

کرونا وائرس جیسی قیامت خیز اور ہلاکت انگیز وبا کی نظیر پوری تاریخ عالم اور تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، جو عالمی وباء کی شکل اختیار کر گئی ہو اور جس نے بے شمار افراد کو لقمۂ اجل بنایا ہو۔ کرونا نے تمام شعبہائے زندگی کو بری طرح متاثر کیا اور لوگوں کو نئے نئے زاویہ سے سوچنے پر مجبور کیا، اس وبا کی وجہ سے بہت سے نئے اور اہم شرعی مسائل پیدا ہوئے، بلکہ اس تعلق سے علماء اور فقہا کے سامنے مسائل کا انبار جمع ہو گیا، لوگ کرونا سے پیدا شدہ نئے مسائل وسوالات دریافت کرنے لگے، ایسے ناگفتہ بہ حالات کا تقاضا سمجھ کر مجلس نے کرونا کے مسائل پر سیمینار کرنے کا فیصلہ کیا اور ''کرونا سے پیدا ہونے والے چند اہم سوالات اور مسائل'' کے عنوان سے سوال نامہ تیار کر کے ملک اور بیرون ملک کے منتخب علماء اور چیدہ ارباب افتاء کی خدمت میں بھیجا، بہت سے علماء اور اصحاب افتاء نے تحقیق ومطالعے کے بعد ارسال کردہ سوال نامے کے جوابات تحریر کیے اور حالات معتدل ہونے پر ۲۳، ۲۴/ نومبر ۲۰۲۲ کے فقہی سیمینار میں مقالات وفتاوی اور شرکاء کے باہمی تبادلہ خیال کے بعد اتفاق رائے سے اس موضوع پر اہم تجاویز منظور کی گئیں۔

۶۲۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب انھیں مقالات وتجاویز کا مجموعہ ہے، اس کے مرتب مفتی رحمت اللہ ندوی صاحب ہیں، پانچ ابواب پر منقسم یہ مجموعہ بہت ہی مرتب انداز میں محنت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ مجموعے کا آغاز ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے مختصر مقدمے سے ہوتا ہے، اس کے بعد سکریٹری مجلس جناب مولانا عتیق احمد بستوی کا پیش لفظ ہے، پھر عرض مرتب ہے، جس سے کرونا وائرس کی بنیادی معلومات اور تاریخ معلوم ہو جاتی ہے، یہ اردو مقالات کا مجموعہ ہے، کرونا کے موضوع پر مجلس کو دو عربی مقالے بھی موصول ہوئے تھے، ان میں ایک مقالہ فلسطین کے مفتی عام اور مسجد اقصی کے خطیب شیخ محمد احمد کا ہے اور دوسرا استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء ڈاکٹر محمد علی شفیق ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ) کا۔

ان دونوں مقالوں کو ایک الگ کتابی شکل میں ''جائحۃ کورونا: قضایا وحلول'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اسے بھی مفتی رحمت اللہ صاحب ندوی نے مرتب کیا ہے، دونوں مجموعے محاور کے اعتبار سے مرتب کیے گئے ہیں، اس وجہ سے

قارئین کے لیے ان دونوں مجموعوں سے استفادہ آسان ہے۔آئندہ خدانہ کرے ایسے حالات پیش آئیں۔ان دونوں مجموعوں سے ایسی مہلک اور خطرناک صورتحال میں بہت مدد ملے گی،ان شاءاللہ۔

* **اسلامی عائلی قوانین (مجموعہ مقالات مسلم فیملی لا لکچر سیریز)**

مجلس تحقیقات شرعیہ جن کاموں کو انجام دے رہی ہے ان میں سے ایک اہم کام''مسلم فیملی لا لکچر سیریز'' ہے، مجلس کو اس کام کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ طبقہ علماء میں اس بات کا احساس پایا جاتا تھا کہ مسلم پرسنل لاء سے متعلق ہندوستان میں رائج قوانین کے بارے میں ہماری واقفیت بہت کم ہے اور موجودہ قوانین کی اصطلاحات سے ناواقف ہونے کی بنیاد پر وکلا اور ججز کے ساتھ افہام وتفہیم میں دشواری پیش آتی ہے۔اسی طرح مجلس نے یہ بھی محسوس کیا کہ عصری تعلیم یافتہ افراد،خصوصا وکلا اور قانون سے وابستہ افراد کو اسلامی شریعت کے مقاصد،شرعی احکام کے مصالح اور اس کی حکمتوں سے واقف کرانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے،کیوں کہ یہی افراد عدالتوں میں اسلامی شریعت کی ترجمانی و وکالت کرتے ہیں،جب کہ اسلامی شریعت سے متعلق ان کی معلومات بہت ناقص ہوتی ہے۔

لہذا اگر اسلام کے عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لاء کے موضوعات پر ایسی مشترکہ نشستیں ہوں،جس میں وکلا اور ماہرین قانون کے ساتھ علماء اور فقہاء کی بھی شرکت ہو اور دونوں طبقوں کے درمیان تبادلۂ خیال اور افادہ واستفادہ کا موقع فراہم ہو تو ایسی نشستیں دونوں طبقوں کے لیے حددرجہ مفید ہوں گی اور دور حاضر میں اسلامی شریعت کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوں گی۔

اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مجلس نے''مسلم فیملی لا لکچر سیریز'' کا آغاز ۶ دسمبر ۲۰۲۰ کو کیا،جو تا حال جاری ہے،اب تک ان میں نکاح،طلاق،خلع،فسخ،حضانت،نفقہ،نسب،ہبہ،وصیت اور میراث جیسے اہم موضوعات پر لکچرز ہوئے ہیں،لکچرز عام طور سے مقالہ کی شکل میں ہی ہوتے ہیں،مجلس کے رفیق علمی مفتی منور سلطان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے ان مقالات کو''اسلامی عائلی قوانین'' کے نام سے بڑی تندہی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جمع کیا ہے،جو ۳۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

بلا شبہ یہ مجموعہ قانون اسلامی خصوصا مسلم پرسنل لا اور مسلم فیملی لا سے شغف رکھنے والے حضرات کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا،اور اسلامی عائلی قوانین کی توضیح وتشریح اور ان کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور شبہات کے ازالے میں معاون ہوگا۔

مجلس سے ایک گزارش ہے کہ اس مجموعے کو ہندی،انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی منتقل کرایا جائے،تاکہ اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو،اس کوشش کا اظہار مجلس کے سکریٹری جناب مفتی عتیق احمد بستوی صاحب نے کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے،اللہ کرے اس پر عمل درآمد ہو جائے۔

* علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند فقہی مقالات

یہ سچ ہے کہ ندوۃ العلماء کے گل سرسبد، علامہ شبلی نعمانی کے مایہ ناز شاگرد رشید، ان کے سچے علمی جانشین اور سرزمین ہند بالخصوص ندوہ کے قابل فخر سپوت سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی نے فقہ کے موضوع پر باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں فرمائی ہے، لیکن فقہی موضوعات پر منتشر جو قیمتی ذخیرہ اور فقہی سرمایہ ان کا متروکہ تھا، اسے ایک کتابی شکل میں بہت ریاضت اور عقیدت کے ساتھ مفتی رحمت اللہ ندوی صاحب نے جمع کر کے بالعموم علمی دنیا اور بالخصوص فقہی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے، جس پر وہ تشکر کے اہل ہیں۔

بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

''مولانا سید سلیمان ندوی مسائل فقہ میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، وہ عصری رجحانات پر غور وفکر کرتے تھے اور مسائل پر رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔'' اسی وجہ جب آپ اس کتاب میں سید صاحب کے فقہی مضامین و مقالات پڑھیں گے، تو آپ کو سید صاحب کی فقہی بصیرت ومہارت، اس سے گہری واقفیت، قوت استنباط، فقہا کے دلائل کا وسیع مطالعہ اور فقہ اسلامی پر ان کے عبور کا بھرپور اندازہ ہوگا۔

کتاب کے صفحہ ۲۲۲-۲۲۵ / پر ''عورتوں کے حقوق اور خصائص'' کے عنوان سے سید صاحب کی ایک تحریر ہے، اس میں ''الرجال قوامون علی النساء'' آیت قرآنی کے اثر کا ذکر سید صاحب کے گہر بار قلم سے کچھ اس طرح ہے:

''اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے عورتوں کو بیرون خانہ کی زحمت سے بچایا ہے اور نفقہ کے فرض کا بار مرد کے دوش و بازو پر ڈالا ہے، تا کہ یہ نازک پھول صرصر حوادث سے پژمردہ نہ ہو اور یہ لطیف شیشہ مشکلات روزگار کی ٹھوکروں سے چور نہ ہو، اس لیے اگر ایک معتدبہ زمانے تک شوہر اپنے اس فرض سے غافل رہے، تو عورت کو حق پہنچتا ہے کہ وہ عدالت شرعی میں جا کر اپنے وجود کو اس مشئوم ہستی سے علیحدہ کرالے اور پھر وہ کسی سعید ہستی سے اپنا پیمان محبت باندھے۔'' (صفحہ ۲۲۳-۲۲۴)

سید صاحب کی چند فقہی آراء اور تحقیقی مسائل کا اندازہ حسب ذیل عناوین سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱) طلاق مکرہ واقع نہیں ہوتی (۲) اردو میں خطبہ جمعہ کا جواز (۳) نابالغ کا نکاح درست، لیکن بلا کسی سبب کے مناسب نہیں (۴) لاؤڈ سپیکر پر نماز کا جواز (۵) ریڈیو اور فون پر رویت ہلال کا اعلان (۶) جمع بین الصلاتین (۷) مصارف زکوۃ اور تملیک وغیرہ۔

مجلس کے تحت ہونے والی سرگرمیوں پر مشتمل مطبوعات کے تعارف کے بعد اب ہم مجلس تحقیقات شرعیہ کی تاریخ اور اس کے علمی منہج پر روشنی ڈالنے والے دو رسالے کا تعارف پیش کرتے ہیں:

* مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، مختصر تاریخ اور سرگرمیاں

یہ رسالہ مجلس کے بہت سے پہلوؤں پر گفتگو کرتا ہے، مجلس کے قیام کا پس منظر، اس کے مقاصد اور طریقہ کار، مسائل کی پہلی فہرست، مجلس تحقیقات شرعیہ کا استقبال، مجلس کے فیصلے پر اہل علم کا تاثر، مجلس کی کوششیں نئے انداز میں، تحقیقات شرعیہ کے احیاء کی ضرورت، مقاصد میں توسیع، مشاورتی کمیٹی اور مجلس کے علمی معاونین وغیرہ سے متعلق یہ رسالہ معلومات فراہم کرتا ہے، اسی طرح مجلس کے قیام کے روز اول سے ۲۰۱۹ تک کی سرگرمیوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ صفحہ: ۶۲/ سے ۲۰۲۰ تا ۲۰۲۲ کی سرگرمیوں کا ذکر بھی رسالے کا حصہ ہے۔ مفتی منور سلطان ندوی صاحب نے بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ اس رسالے کی تالیف کا کام انجام دیا ہے۔

یہ مختصر رسالہ قارئین کو مجلس کی تاریخ، مقاصد، طریقہ کار اور سرگرمیوں سے مکمل طور پر واقف کراتا ہے، مجلس کے قدردانوں کی جانب سے مؤلف اس کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

٭ مجلس تحقیقات شرعیہ کا علمی منہج

یہ کتابچہ دو مقالوں پر مشتمل ہے:

(۱) مسلم ممالک میں پرسنل لا اور جدید تمدن کے پیدا کیے ہوئے قابل غور مسائل از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

(۲) تدوین فقہ کی تاریخ اور موجودہ حالات کا جائزہ از مولانا محمد تقی امینیؒ

یہ دونوں چشم کشا اور رہنما مقالے مجلس کے پہلے اجلاس میں ملک کے منتخب ترین علماء اور اصحاب افتاء کے سامنے پیش فرمائے گئے تھے، جو بنظر تحسین دیکھے گئے تھے، یہ دونوں مقالے مجلس کے مقاصد، علمی وفکری منہج اور نئے پیش آمدہ مسائل پر اجتماعی غور وفکر کی اہمیت وضرورت اور طریقہ کار پر واضح انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ دونوں فکر انگیز مقالے کے بارے میں کتابچے کے پیش لفظ میں جناب مولانا عتیق احمد بستوی رقمطراز ہیں:

”ان دونوں مقالات کو ہم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کی علمی وفکری اساس قرار دے سکتے ہیں، دونوں بزرگوں نے بڑی بلند نظری، دقیقہ رسی اور دوراندیشی کے ساتھ حالات کا تجزیہ پیش کیا....اور ایسی بنیاد فراہم کردی جن پر قائم رہتے ہوئے تحقیق واجتہاد کے اس عمل کو بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دیا جاسکتا ہے۔“ (ص:۵)

اسی معنویت کے پیش نظر مولانا منور سلطان ندوی صاحب نے ماہ نامہ الفرقان، لکھنو اور پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنو کی قدیم فائلوں سے ان دونوں مقالوں کو حاصل کرکے انہیں مرتب کیا، تاکہ اہل علم ان سے مستفید ہوسکیں اور مجلس کے علمی وفکری منہج سے واقف ہوسکیں۔

اب ان کتابوں اور رسالوں کا مختصر تعارف قلم بند کیا جارہا ہے، جو مجلس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہونے کی بناپر تصحیح ونظر ثانی کے بعد مجلس کی جانب سے دوبارہ شائع کیے گئے ہیں:

* ہندوستان میں نفاذ شریعت

شریعت مسلمانوں کو اللہ کی جانب سے عطا کردہ وہ بہترین نظام زندگی ہے کہ جس کے مطابق زندگی گزار کر مسلمان اس دنیا میں کامیاب ہوسکتا ہے اور آخرت میں سرخ رو ہوسکتا ہے، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے تعلق سے شریعت کی رہنمائیاں موجود نہ ہوں، اس سے بہتر کوئی نظام زندگی نہیں ہوسکتا، یہ عین انسانی فطرت کے موافق ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان حتی المقدور شریعت کے مطابق زندگی گزاریں۔ تحفظ شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسلمان خود شریعت پر عمل پیرا ہوجائیں تو شریعت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا، حکومت وغیرہ کے ذریعے تحفظ شریعت کا کوئی خاص مسئلہ نہ رہے گا، لیکن مسلمان خود شریعت پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو اللہ کے سوا کوئی شریعت کا تحفظ نہیں کرسکتا۔

''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' مولانا عتیق احمد بستوی کی فکر انگیز تصنیف ہے۔ مولانا ملک کے نامور فقیہ، مستند محقق اور فاضل مصنف ہیں، آپ کی زبان میں متانت و روانی اور فکر میں پختگی و سلامتی پائی جاتی ہے، مولانا کی تحقیقات، تحریریں اور کتابیں ممتاز مقام رکھتی ہیں، موصوف متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ تصنیف لطیف ہندوستان میں احکام شریعت کے نفاذ پر ایک تحقیقی اور دستاویزی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب میں ۱۷/ مرکزی عناوین اور پونے دوسو کے قریب ذیلی عناوین کے ذریعے فاضل مصنف نے بڑے دلنشین اور قابل فہم انداز میں یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں نفاذ شریعت کیوں کر ہو؟ اس کے مراحل کیا ہوں؟ اس کا تحفظ کیسے ہو؟ اس سلسلے میں جدوجہد کے میدان کیا ہیں اور اس کا طریقہ کار کیا ہے؟

یہ کتاب مولانا موصوف کے ان قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے، جو اسلام کے عائلی قوانین، اسلامی شریعت کی تشریح اور مدافعت میں لکھے گئے ہیں، ان میں متعدد مضامین ہندوستان کی عدالت عالیہ اور مختلف ذیلی عدالتوں کے بعض فیصلوں کے جائزے اور تنقید پر مشتمل ہے۔ ۳۲۸ صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر کامیاب ترین پیشکش ہے۔

* اجتہاد اور کار اجتہاد

جناب مولانا عتیق احمد بستوی صاحب کی یہ تصنیف بہت علمی وفکری ہے، جو اصول فقہ کے چند اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اصول فقہ پر مولانا کی گہری اور اچھی نظر ہے۔ یہ کتاب فاضل مصنف کے مقالات کا مجموعہ ہے، ان میں سے بعض مقالات اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے سیمناروں کے لیے تحریر کیے گئے ہیں، بعض سہ ماہی بحث ونظر، پٹنہ کے لیے لکھے گئے ہیں اور بعض مقالات کسی اور مناسبت سے سپرد قلم کیے گئے ہیں۔

کتاب کے ذیلی عناوین سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، عناوین درج ذیل ہیں:

(۱) اجتہاد اور کار اجتہاد (۲) ضرورت وحاجت (۳) عرف وعادت (۴) فقہی نظریہ سازی۔ تعارف

اور جائزہ (۵) مقاصد شریعت-تعارف وتطبیق (۶) مقاصد شریعت-عہد بہ عہد تاریخی جائزہ (۷) فقہائے احناف کے طبقات (۸) دیانت وقضا۔

یہ کتاب فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی قیمتی تقریظ وتعارف سے مزین ہے، جس نے کتاب کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔

* **اسلام کا نظام میراث**

اسلام کا نظام میراث کتابچہ مولانا عتیق احمد بستوی صاحب نے اس لیے تیار کیا ہے تاکہ اسلام کے قانون میراث پر کئے جانے والے بعض اعتراضات کے جوابات دیے جا سکیں اور میراث میں عورتوں (بیوی، لڑکی، ماں) کے حصوں کو اجاگر کیا جا سکے، کیوں کہ عام طور پر مسلم معاشرے میں عورتوں کو حق میراث سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اسلام کے عادلانہ قانون میراث پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ بھی مولانا بستوی صاحب نے میراث سے متعلق چند پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

اس کتابچہ کے متعدد ایڈیشن مسلم پرسنل لا کی جانب سے شائع کیے گئے ہیں، جو یقینا مسلم معاشرہ کے لیے مفید ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ نے بھی اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

* **عائلی تنازعات کا شرعی حل اور شوہر کو حق طلاق کیوں؟**

کتابچہ کے مقدمہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''دور حاضر میں اسلام کے جن قوانین پر بکثرت اعتراضات کیے گئے ہیں اور ان کے حوالہ سے اسلام کو بدنام کرنے کی ہر پیمانہ پر کوششیں ہوئی ہیں، ان میں ایک طلاق کا مسئلہ ہے، شوہر کو حق طلاق کا اختیار دیے جانے کو مغربی مفکرین نے عورتوں کے حق میں ظلم اور حق تلفی قرار دیا ہے، جب کہ اسلام کا قانون طلاق سارے انسانوں خصوصًا عورتوں کے لیے سراپا رحمت ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال کتاب وسنت کے مطابق کیا جائے۔'' (ص:۵-۶)

مذکورہ باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا عتیق احمد بستوی صاحب نے یہ کتابچہ تالیف فرمایا ہے، تاکہ قانون طلاق کی معنویت کو خالص عقلی انداز میں سمجھایا جا سکے اور قانون طلاق کے بارے میں کیے جانے والے اعتراضات کا سنجیدہ علمی اور اطمینان بخش جواب دیا جا سکے۔ مجلس کی اشاعت سے قبل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس کتابچے کے کئی ایڈیشن شائع کیے اور معہد الشریعہ لکھنؤ نے بھی ایک ایڈیشن شائع کیا۔

دعا کرتے ہیں کہ مؤلف کی یہ کاوشیں بارگاہ خداوندی میں قبول ہوں اور علمی ودینی حلقوں کے لیے کارآمد وبارآور ہو۔

* **نظرية تقديم الأقوى**

''نظرية تقديم الأقوى'' بلاشبہ اپنے موضوع پر پہلی اور فقہی نظریہ سازی کی فن پر ہندوستان میں پہلی عربی

کتاب ہے۔ یہ کتاب علماء وفقہاء کو ایک وسیع اور عظیم فقہی نظریہ، ان کی بنیادوں اور بہت سے گوشوں سے آشنا کراتی ہے، جو نظریہ بہت سے فقہی قواعد وکلیات کی اساس ہے اور جو مختلف علوم وفنون اور میدانوں پر محیط ہے۔ ڈاکٹر محمد علی شفیق ندوی صاحب نے اس عظیم نظریہ کے مطالعہ وتحقیق اور اس کی پیش کش کے میدان میں پہل کی ہے۔

یہ کتاب بڑی عرق ریزی وجگر کاوی سے تصنیف کی گئی ہے اور اس کی تصنیف میں ۳۰۰ کے قریب قدیم وجدید کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کتاب کی تصنیف پر ہم مصنف کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں، کیوں کہ یہ علماء اور فقہاء کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

* **اسلام میں طلاق کا عادلانہ نظام اور اس کی حکمت وبرکت قرآن وسنت کی روشنی میں**

مصنف کتابچہ کے پیش لفظ میں کتابچہ کے پس منظر کو حوالۂ قرطاس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تحریر کو لکھنے کا سبب ہمارے ملک کی وہ ہنگامی وبگڑتی صورت حال ہے جس میں طلاق کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش رچی گئی، بلکہ جس کے ذریعہ شریعت اسلامی (مسلم پرسنل لا) کو نشانہ بنانے کی راہ ہموار کی گئی اور ملک کے پارلیمنٹ میں عددی اکثریت کی بنا پر طلاق کے سلسلہ میں وہ بل منظور کرالیا، جس کی زد شریعت اسلام پر پڑتی ہے۔'' (ص:۱۱)

واقعی مصنف نے بہت سادہ، عام فہم اور مؤثر انداز میں ۳۸ عناوین کے ذریعے اسلام میں طلاق کے عادلانہ وحکیمانہ نظام اور اس کی حکمت وبرکت کو قرآن سنت کی روشنی میں پیش کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے، اور بتایا ہے کہ اسلام کا قانون طلاق زحمت نہیں رحمت ہے، جس طرح نکاح انسانی ضرورت ہے، اسی طرح بعض خاص حالات میں طلاق انسانی ضرورت ہے۔

درج ذیل چند عناوین سے کتابچہ کی افادیت کا پتہ چلتا ہے:

(۱) دور جاہلیت میں طلاق کی ظالمانہ صورتیں (۲) دوسرے مذاہب میں طلاق کی صورتیں اور اس کے خطرناک نتائج (۳) اسلام میں طلاق کی اجازت کب اور کیوں؟ (۴) اسلامی طلاق میں اعتدال اور حکمتیں (۵) عالمی تناظر میں طلاق۔ ایک جائزہ (۶) دنیا میں سب سے زیادہ طلاق والے ممالک

یہ کتاب قانون طلاق کی معنویت، اہمیت، افادیت، ضرورت اور اس کی معقولیت نیز طلاق کے بارے میں حقائق کو واضح کرنے میں بڑی مدد ومعاون ثابت ہوگی۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کی موجودہ گرمیاں

عبادالحق آسامی ندوی
(باحث مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

قدیم ادوار میں راسخ العلم علماء کی انفرادی واجتماعی کوششیں جہاں جدید پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے کافی ہوتی تھیں وہیں کتاب وسنت کی روشنی میں ان کے طے کردہ اصول ومبادی مستقبل کے مسائل کے دریا کو پار کرنے والوں کے لئے پُل ثابت ہوئے ہیں، امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) ان کے تمام شاگرد، امام مالک (۱۷۹ھ)، امام شافعی (۲۰۴ھ) اوران کے ممتاز شاگرد اور امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) جیسے بے شمار قدآور علماء اسی صف میں کھڑے ملیں گے، علماءِ حجاز کے علاوہ برصغیر ہندوپاک میں مجدد الف ثانی (۱۶۲۴ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۶۲ء)، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۸۲۳ء)، مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۱۸۸۶ء)، مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۹۰۵ء)، مولانا محمد علی مونگیری (۱۹۲۷ء)، مفتی عزیز الرحمن عثمانی (۱۹۲۸ء)، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (۱۹۴۰ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳ء)، مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۹۵۲ء)، اور مولانا عبدالصمد رحمانی (۱۹۷۲ء) وغیرہ علماء کی قابلِ قدر کوششیں رہی ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں اجتماعی اجتہاد واجتماعی غور وخوض کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی، کیونکہ اس متمدن اور ترقی یافتہ دور میں عوام تو عوام پڑھے لکھے طبقوں میں بھی بے چینی کی وبا پھیل رہی تھی، اور اسلامی تعلیمات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، اجتماعی مسائل کو جلد از جلد حل کرنے اور اسلام پر اعتماد بحال کئے جانے کی حد درجہ ضرورت تھی کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اسلام کا حال بھی عیسائیت اور دیگر ادیان کی طرح ہو جاتا، چنانچہ اس کے لئے منظم طور پر اکیڈمیاں قائم کی گئیں، کمیٹیاں وجود میں آئیں، سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں جامعہ ازہر نے ''مجلس البحوث الاسلامیۃ'' کے نام سے ایک اجتماعی ادارہ قائم کیا جس کی شاندار علمی اور تحقیقی سرگرمیاں ہیں، اس کے بعد یہ خوش قسمتی ندوۃ العلماء کے نصیب میں آئی ''مجلسِ تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلما'' کا قیام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی (۱۹۹۹ء) رحمہ اللہ کی کوششوں سے ۱۹۶۳ء میں عمل میں آیا جبکہ ''مباحثِ فقہیہ'' ۱۹۸۰ء میں، ''جدہ فقہ اکیڈمی'' ۱۹۸۳ء میں، ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' ۱۹۸۹ء میں اور ''مکہ فقہ اکیڈمی'' ۱۹۹۶ء میں وجود میں آئیں، جن کی خدمات وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہیں۔

مجلسِ تحقیقات شرعیہ کی خدمات

یوں تو مجلس نے شروع دن سے ہی اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں، اس کے ناظمِ اول حضرت مولانا محمد تقی امینی صاحب (۱۹۹۱ء) رحمہ اللہ نے روزِ اول سے ہی زور وشور سے کام کا آغاز کر دیا تھا، مسئلۂ انشورنس کا سوال نامہ بھی تیار ہو چکا تھا، ان کے محدود وقت تک بہت ہی سرگرمی سے افتتاحی، تاسیسی اور مشاورتی نشستیں ہوئیں، جن میں بر صغیر ہندو پاک کے ممتاز علماء کی شرکت رہی، لیکن ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ میں ان کی منتقلی ہوگئی، ان کی منتقلی کے بعد مجلس کے دوسرے ناظم کے طور پر حضرت مولانا اسحاق سندیلوی صاحب (۱۹۹۵ء) رحمہ اللہ مقرر ہوئے، آپ کے زمانۂ انتظام وانصرام میں بڑی خوبی کے ساتھ انشورنس اور رؤیتِ ہلال جیسے اہم مسائل پر تجاویز پاس ہوئیں اور سرکاری قرضے کے مسئلہ پر اجتماعی غور وخوض کا نظام بھی بن گیا، مگر افسوس وہ بھی ۱۹۷۰ء میں یہاں سے پاکستان منتقل ہو گئے، اس کے بعد مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب (۲۰۲۰ء) رحمہ اللہ مجلس کے تیسرے ناظم بنائے گئے، اور کام جاری رہا، لیکن بد قسمتی سے ۱۹۷۱ء میں کسی وجہ سے اجتماعی بحث وتحقیق انفرادی نظام میں تبدیل ہوگئی، اور سارا کام مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب رحمہ اللہ کے سپرد ہو گیا، تا دمِ حیات اس سلسلے میں ان کا عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل جاری رہا، پھر لاک ڈاؤن کے بعد ۲۰۲۰ء میں کچھ نئے عزائم اور نئے حوصلوں کے ساتھ مجلس کی تشکیلِ نو ہوئی، دراصل تشکیلِ نو کا خاکہ مولانا برہان الدین سنبھلی رحمہ اللہ کی حیات ہی میں مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب (۲۰۲۳ء) رحمہ اللہ نے اور دیگر ذمہ داروں نے پیش کیا تھا، مجلس نے نئے عزائم کے ساتھ بحث وتحقیق کی دنیا میں ایک بلند پرواز بھرنے کی ٹھانی، تشکیل نو کے بعد سے مجلس اپنے عزائم میں رواں دواں ہے۔

مجلس کی حالیہ سرگرمیاں

مجلس تحقیقات شرعیہ کی جانب سے متعدد سرگرمیاں جاری ہیں، جن میں فیملی لا لیکچر سیریز، لیگل لٹریسی کورس، سالانہ فقہی سیمینار، علمی و تحقیقی کتابوں کی طباعت اور بحث وتحقیق قابلِ ذکر ہیں:

مسلم فیملی لا لیکچر سیریز:

اس سلسلہ وار پروگرام کا مقصد وکلاء حضرات کو اسلام کے عائلی قوانین سے واقف کرانا اور ان کے ذہن و دماغ سے غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے، سالِ رواں اس کے دو پروگرام ہوئے ہیں، ایک علمی مذاکرہ بعنوان ''نفقۂ مطلقہ: شرعی اور قانونی نقطۂ نظر'' بتاریخ ۷ جولائی ۲۰۲۴ء کو ہوا تھا، یہ اس سلسلے کا ۲۰ واں پروگرام تھا، اس میں مفتی عتیق احمد بستوی صاحب دامت برکاتہم سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، پروفیسر نسیم احمد جعفری صاحب ڈین فیکلٹی آف لاء انٹگریل یونیورسٹی اور ہائی کورٹ لکھنؤ کے وکیل ایڈووکیٹ اوصاف احمد خان صاحب نے معلومات افزا مقالات پیش

کیا، مفتی ظفر عالم ندوی صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے تمہیدی گفتگو کی، شرکاءِ محفل میں ندوہ کے اساتذہ، طلبہ اور شہر کے وکلاء موجود تھے، اس پروگرام کا اچھا تاثر رہا، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے مسائل سامنے آئے، ان کی مجبوریوں اور مصیبتوں کو سامنے لایا گیا اور اسلام کے نقطہ نظر سے ان پر بحث کی گئی، اور اس تعلق سے اسلامی قوانین کی حکمتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔

اور دوسرا پروگرام بعنوان ''وقف امینڈ مینٹ بل ۲۰۲۴ء'' بتاریخ ۳ ستمبر بروز منگل ۲۰۲۴ء کو منعقد ہوا، یہ ۲۱ واں پروگرام تھا، اس شاندار اور اہم پروگرام کے میر کارواں مولانا عتیق احمد بستوی صاحب (سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ) تھے، مولانا منور سلطان ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ) نے نظامت کا کام انجام دیا، مفتی ظفر عالم ندوی صاحب (استاذ دار العلوم ندوہ العلماء) نے "وقف کی شرعی حیثیت: "چند بنیادی باتیں" کے عنوان سے بیش قیمتی محاضرہ پیش کیا، جناب عبدالحفیظ صاحب (ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لکھنؤ) نے "ہندوستان میں وقف قوانین اور وقف ایکٹ ۱۹۹۵" پر روشنی ڈالی اور مفتی ابرار حسن ندوی صاحب (ایل ایل ایم) نے "وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ء کی مجوزہ ترمیمات کا جائزہ" کے موضوع پر گفتگو کی جبکہ مہمانانِ خصوصی مولانا خالد رشید فرنگی محلی (امام عیدگاہ لکھنؤ)، جناب سید محمد شعیب صاحب (سابق سی ای او سنی سنٹرل وقف بورڈ یوپی) اور جناب زفر احمد فاروقی (چیرمین سنی سنٹرل وقف بورڈ یوپی) جیسی اہم شخصیات نے اپنے خیالات پیش کئے، اور موضوع سے متعلق اہم نکات حاضرین کے سامنے آئے، اس پروگرام میں شہر کے وکلاء اور طلبہ کے علاوہ ندوہ کے اساتذہ بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، اخیر میں مفتی عتیق احمد صاحب کی صدارتی گفتگو کے بعد پروگرام اختتام کو پہنچا۔

لیگل لٹریسی کورس:

مجلس کے زیر اہتمام ندوہ کے اختصاص کے طلبہ کو دستور ہند سے واقف کرانے کے لیے لیگل لٹریسی کورس چل رہا ہے، اس کورس کا آغاز گزشتہ سال ۲۰۲۳ء میں ہوا، اس کورس کا مقصد طلبہ کو وکیل بنانا نہیں ہے بلکہ طلبۂ مدارس کے اندر قانونی بیداری (Legal awareness) کو فروغ دینا ہے، یہ کورس ہم طالبان علوم نبوت کے لیے بڑا مفید رہا، گزشتہ سال افتتاحی تقریب کے علاوہ حیدر حسن خان ٹونکی ہال میں مجلس کی جانب سے دو پروگرام منعقد کئے گئے: ایک پروگرام یوم آئین ہند کے موقع پر جبکہ دوسرا پروگرام سالانہ امتحان کے قریبی دنوں میں لیگل لٹریسی کورس کے اختتام کی مناسبت سے منعقد ہوا تھا، آخر الذکر پروگرام میں ناظم ندوۃ العلماء اور انٹگرل یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر سید وسیم اختر صاحب بھی تشریف فرما ہوئے اور ان دونوں حضرات نے اس کامیاب پروگرام سے اچھا تاثر لیا، اور اس کامیاب کورس کے شروع کرنے پر مبارکباد دی اور دعاؤں سے نوازا، سالِ رواں بھی یہ کورس جاری ہے۔

فتاویٰ عزیزیہ کی تحقیق:

اسی طرح فتاوی عزیزیہ پر بھی بحث وتحقیق کا کام جاری ہے، دراصل مجلس کی تشکیل نو کے ساتھ اس کے نئے عزائم اور مقاصد میں یہ بھی تھا کہ نئے فارغ التحصیل طلبہ کو تصنیفی تربیت دی جائے اور ان کے اندر فقہی مہارت پیدا کرنے کے لئے ان سے فقہی موضوعات پر علمی وتحقیقی کام لیا جائے، اس کے لئے مجلس نے ''تربیت بحث وتحقیق'' کورس کا آغاز کیا، اس میں دو منتخب فضلاء کو کسی کتاب یا موضوع پر بحث وتحقیق کا کام سپرد کیا جاتا ہے، چنانچہ شعبہ نے تحقیق کے لیے گذشتہ سال فتاویٰ عزیزیہ (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ) کا انتخاب کیا تھا، اس پر اب بھی کام مسلسل جاری ہے۔

پانچواں فقہی سیمینار:

سالِ گزشتہ ۲۰-۲۱-۲۲/ اکتوبر ۲۰۲۴ء کو مجلس کا پانچواں سہ روزہ فقہی سیمینار منعقد ہوا تھا، اس شاندار سیمینار میں ملک کے نامور علماء کی شرکت رہی، اور تین نئے اور اہم عناوین ''عوامی مقامات پر نماز'' ''مساجد میں خواتین کی آمد'' اور ''سونے چاندی میں معیار اور ضم نصاب'' جیسے مسائل پر تبادلہ خیالات ہوئے، اور متعدد اہم تجاویز پاس ہوئی تھیں، ان تینوں موضوعات اور تحریروں کا مجموعہ تین کتابوں کی صورت میں تیار ہے، جن کی اشاعت ان شاء اللہ تعالیٰ آنے والے سیمینار (جو ۳۰/ نومبر و یکم دسمبر کو ہونے والا ہے) کے موقع پر ہو جائے گی۔

چھٹا فقہی سیمینار:

۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۲۰۲۴ء کو ندوہ کے احاطے میں دو روزہ مجلس کا چھٹا فقہی سیمینار منعقد ہونے جارہا ہے، جس میں ''جانوروں کی مصنوعی افزائش''، ''بیع معدوم کی جدید شکلیں'' اور ''یسر و تیسیر اور عصر حاضر کے تقاضے'' جیسے نئے اور اہم عناوین پر اجتماعی بحث و مباحثے اور اجتماعی غور وخوض کے بعد تجاویز پاس کی جائیں گی۔

www.mtsnadwa.org ای میگزین

Printed by Maktaba Ahsan, Lucknow

Shariah Academy
For Research & Studies
Nadwatul Ulama, Taigore Marg. Lucknow.U.P.(India)
E-mail. : shariahacademynadwa@gmail.com www.mtsnadwa.org